Regd. L. No. 7243 Phone

قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

طلوعِ اسلام

جون 1980

اس پرچہ میں :

۲۴ - مئی ۱۸۷۵ء

(جب پاکستان کی پہلی اینٹ رکھی گئی)

شائع کردہ ادارۂ طلوعِ اسلام - ۲۵ بی - گلبرگ - لاہور

قیمت فی پرچہ 3 روپے

قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

ماہنامہ طلوعِ اسلام لاہور

قیمت فی پرچہ	ٹیلیفون نمبر ـــــ ۸۸۰۸۰۰	بدلِ اشتراک
۳	خط وکتابت	سالانہ
تین روپے	ناظم ادارۂ طلوعِ اسلام ۲۵ بی گلبرگ ۲ لاہور	پاکستان ۳۶/- روپے غیر ممالک ۳½ پونڈ

شمارہ ۶ | جون ۱۹۸۰ء | جلد ۳۳

فہرست

۱۔ لمعات ـــــــــــــ ۲
۲۔ قرآنی درس کے اعلانات وغیرہ ـــــــــــــ ۹
۳۔ ۲۴ مئی ۱۸۷۵ء (جب پاکستان کی پہلی اینٹ رکھی گئی) ـــــــــــــ ۱۰
ـــــ یوم سرسیدؒ کی تقریب پر خطاب ـــ (محترم پرویز صاحب) ـــــ
۴۔ فہرست معطیان قرآنک ایجوکیشن سوسائٹی ـــــــــــــ ۳۱
۵۔ ریکارڈ میں رکھئے ! ـــــــــــــ ۳۳
۶۔ " انشاء اللہ " ـــ (سر سید احمد خانؒ) ـــــــــــــ ۳۸
۷۔ اسلامی قانون کی تدوینِ جدید (قسط دوم) ـــــــــــــ ۴۱
ـــــ (محترم رفیع اللہ صاحب) ـــــ
۸۔ مکافاتِ عمل (حذر اے چیرہ دستاں! سخت ہیں فطرت کی تعزیریں) ـــــــــــــ ۵۲
۹۔ پاکستان کے ہمدرد اور غمگسار ـــــــــــــ ۵۷

ایڈیٹر محمد خلیل۔ ناشر سراج الحق۔ مقام اشاعت ۲۵ بی گلبرگ ۲ لاہور۔ پرنٹر شیخ نیاز احمد۔ مطبوعہ علمی پرنٹنگ پریس، اسپتال روڈ۔ لاہور

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

لمعات

کچھ عرصہ سے مسلمان ممالک میں بالعموم اور پاکستان میں بالخصوص ایک تحریک اُبھر رہی ہے جسے "احیاءِ اسلام" کہہ کر پکارا جاتا ہے۔ (ضمناً) ہمارے نزدیک یہ اصطلاح صحیح نہیں۔ "احیاءِ اسلام" کے معنی ہیں، اسلام کو زندہ کرنا۔ اسلام نام ہے ان نظریات، اقدار، اصول اور قوانینِ حیات کا جو ابدی اور غیر متبدل ہیں اور قرآن مجید کی دفتین میں محفوظ۔ وہ زندہ ہیں اور ہمیشہ زندہ رہیں گے۔ لہٰذا، انہیں (از سرِ نو) زندہ کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ "احیاءِ اسلام" سے درحقیقت مقصود یہ ہے کہ مسلمانوں کی موجودہ غیر اسلامی زندگی کو اسلام کے مطابق بنایا جائے۔ اس کے لئے انگریزی کی اصطلاح (ISLAMISATION) زیادہ موزوں ہے۔ یعنی مسلمانوں کی غیر اسلامی زندگی کو اسلامی بنانا۔ علامہ اقبالؒ نے اس کے لئے مسلمانوں کی "بازآفرینی" کی اصطلاح وضع کی تھی جو مقصد پیشِ نظر کی صحیح وضاحت کرتی تھی۔ مقصد خود ہماری بازآفرینی ہے اسلام کی نہیں۔

بہرحال، یہ تو ضمنی بات تھی۔ نقطۂ زیرِ بحث یہ ہے کہ آج کل مسلمانوں کے قریب قریب ہر ملک میں "احیاءِ اسلام" کی تحریکیں ابھر رہی ہیں۔ یہ بڑا مبارک شگون ہے اور ہماری دلی تمنا ہے کہ یہ تحریکیں کامیابی سے ہمکنار ہوں۔ خود طلوعِ اسلام کی زندگی کا یہی مقصد ہے۔

لیکن اس نیک شگونی اور حسین تمناؤں کے باوجود، یہ حقیقت ہے کہ اس باب میں کوئی کامیابی تو ایک طرف، پیش رفت بھی دکھائی نہیں دیتی۔ مسلمانوں کی زندگی اور ان کے معاشرہ میں کہیں ایسی تبدیلی نظر نہیں آتی جو انہیں اسلام کے قریب لے آئے۔ اس کی وجہ ہم متعدد بار بیان کر چکے ہیں اور اب بھی ذرا آگے چل کر دہرائیں گے۔ لیکن اس سے جو خطرہ لاحق ہو رہا ہے، اس کی طرف بار بار توجہ دلانا نہایت ضروری ہے۔ وہ خطرہ یہ ہے کہ ہماری نوجوان نسل کے دل میں یہ خیال جاں گزیں ہوتا چلا جا رہا ہے کہ اسلام میں اب یہ صلاحیت ہی نہیں رہی کہ وہ انسانی زندگی میں کوئی تبدیلی پیدا کر سکے۔ یہ (طلوعِ اسلام کی پیش کردہ اصطلاح کے مطابق) ایک "چلا ہوا کارتوس" ہے۔ مسلمانوں کی زندگی میں اسلام کے مطابق تبدیلی پیدا نہ ہونا بھی اندوہناک ہے لیکن اس سے کہیں زیادہ اندوہناک وہ تاثر ہے جو اس سے ہمارے نوجوانوں کے دل میں پیدا ہو رہا ہے اور جس سے خطرہ یہ ہے کہ وہ (اسلام کی طرف سے مایوس ہو کر) کہیں کھلے بندوں الحاد اور بے دینی کی آغوش میں نہ چلے جائیں۔ یہ خطرہ مزعومہ نہیں۔ اس کا نہایت تاسف انگیز اور عبرتناک مشاہدہ ہم اس سے پہلے کر چکے ہیں۔ (مولانا) ابوالکلام آزاد (مرحوم) کے تبحرِ علمی کی دھاک بیٹھی ہوئی

تھی۔ وہ "امام الہند" کہکر پکارے جاتے تھے۔ وہ "احیاء اسلام" کے بہت بڑے داعی تھے۔ اس باب میں ان کے مجلّہ "الہلال" نے عالمگیر شہرت اختیار کر رکھی تھی۔ وہ کہا کرتے تھے :۔

پس اے عزیزانِ ملت! اور اے بقیہ ماتم زدگانِ قافلۂ اسلام!! اگر یہ سچ ہے کہ دنیا کے کسی گوشے میں پیروانِ اسلام کے سروں پر تلوار چمک رہی ہے تو تعجب ہے اگر اس کا زخم ہم اپنے دلوں میں نہ دیکھیں۔ اگر اس آسمان کے نیچے کہیں بھی ایک مسلم پیرو ئے توحید کی لاش تڑپ رہی ہے تو لعنت ہے ان سات کروڑ زندگیوں پر جن کے دلوں میں اس کی تڑپ نہ ہو۔ اگر مراکش میں ایک حامیٔ وطن کے حلق بریدہ سے خون کا فوارہ چھوٹ رہا ہے تو ہم کو کیا ہو گیا ہے کہ ہمارے منہ سے دل و جگر کے ٹکڑے نہیں گرتے؟ ایران میں اگر وہ گردنیں پھانسی کی رسیوں میں لٹک رہی ہیں جن سے آخری ساعتِ نزع میں اشہد ان لا الٰہ الا اللہ کی آواز نکل رہی تھی تو ہم پر اللہ اور اس کے ملائکہ کی پھٹکار ہو اگر اپنی گردنوں پر اس کے نشان محسوس نہ کریں۔ اگر آج بلقان کے میدانوں میں حافظینِ کلمۂ توحید کے سر اور سینے صلیب پرستوں کی گولیوں سے چھن رہے ہیں تو ہم اللہ، اس کے ملائکہ اور اس کے رسولؐ کے آگے ملعون ہوں اگر اپنے پہلوؤں کے اندر ایک لمحہ کے لئے بھی راحت اور سکون محسوس کریں۔ میں کیا کہہ رہا ہوں؟ حالانکہ اگر اسلام کی روح کا ایک ذرہ بھی اس کے پیروؤں میں باقی ہے تو مجھ کو کہنا چاہیئے کہ اگر میدانِ جنگ میں کسی ترک کے تلوے میں ایک کانٹا چبھ جائے تو قسم ہے خدائے اسلام کی کہ کوئی ہندوستان کا مسلمان، مسلمان نہیں ہو سکتا جب تک وہ اس کی چبھن کو تلوے کی جگہ اپنے دل میں محسوس نہ کرے۔ کیونکہ ملّتِ اسلام ایک جسمِ واحد ہے۔ اور مسلمان خواہ کہیں ہوں، اس کے اعضاء و جوارح ہیں۔ اگر ہاتھ کی انگلی میں کانٹا چبھے تو جب تک باقی اعضاء کٹ کر الگ نہ ہو گئے ہوں، ممکن نہیں کہ اس کے صدمے سے بے خبر رہیں۔ اور یہ جو کچھ کہہ رہا ہوں محض اظہارِ مطلب کا زورِ بیان ہی نہیں ہے بلکہ عین ترجمہ ہے اس حدیثِ مشہورہ کا جس کو امام احمد و مسلم نے نعمان بن بشیر سے روایت کیا ہے کہ جنابِ رسولِ کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم نے فرمایا :۔

مثل الجسد، اذا اشتکی لہٗ عضوٌ تداعی لہٗ سائر الجسد بالسّھر والحمی (الحدیث)

مسلمانوں کی مثال باہمی مودّت و مرحمت اور محبت و ہمدردی میں ایسی ہے جیسے ایک جسمِ واحد کی۔ اگر اس کے ایک عضو میں کوئی شکایت پیدا ہوتی ہے تو سارا جسم اس تکلیف میں شریک ہو جاتا ہے۔

اور اسی کے ہم معنی صحیحین کی وہ حدیث ہے جس کو ابوموسیٰ اشعریؓ نے روایت کیا ہے کہ

الموٴمن للموٴمن کالبنیان یشدّ بعضہٗ بعضاً۔

ایک مومن دوسرے مومن کے لئے ایسا ہے جیسے کسی دیوار کی اینٹیں کہ ایک اینٹ دوسری اینٹ کو سہارا دیتی ہے۔

اور فی الحقیقت یہ خصائصِ مسلم میں سے ایک اولین اور اشرف ترین خصوصیت ہے جس کی طرف قرآن کریم نے اپنے جامع و مانع الفاظ میں اشارہ کیا ہے :۔

اَشِدَّآءُ عَلَی الْکُفَّارِ رُحَمَآءُ بَیْنَھُمْ ۔ (۴۸:۲۹)

کافروں کے لئے نہایت سخت مگر آپس میں نہایت رحیم اور ہمدرد ۔ ان میں جس قدر سختی ہے باطل اور کفر کے لئے ۔ اور ان کی جس قدر محبت اور الفت ہے حق و صدق اور اسلام و توحید کے لئے ۔

فاعتبروا یاایھا المسلمون فلا تکونوا کالذین قالوا سمعنا و ھم لا یسمعون ۔ (ابوالکلام)

لیکن اسی ابوالکلام کی جب یہ دعوت ناکام رہی تو وہ (تحریکِ پاکستان کی مخالفت کرتے ہوئے) یہ کہتا ہوا دنیا سے رخصت ہوگیا کہ

یہ سب سے بڑا فریب (FRAUD) ہے جس میں لوگوں کو مبتلا کیا جا رہا ہے کہ دین کا رشتہ ان خطوں کو متحد کر دے گا جو جغرافیائی، معاشی اور لسانی اور ثقافتی اعتبار سے ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ یہ ٹھیک کہ اسلام نے ایک معاشرہ قائم کرنا چاہا تھا جو نسلی، لسانی، معاشی اور سیاسی حدود سے ماوراء ہو، لیکن تاریخ نے ثابت کر دیا کہ چند ہی سالوں کے بعد ـــــــ یا زیادہ سے زیادہ ایک صدی کے بعد اسلام اس قابل نہ رہا کہ مسلمانوں کے مختلف ممالک کو محض اسلام کی بنیاد پر ایک مملکت بنا سکے ۔

(INDIA WINS FREEDOM - P. 227)

مندرجہ بالا اقتباس میں آپ ان الفاظ پر غور کیجئے ۔ "اسلام نے ایک معاشرہ قائم کرنا چاہا تھا .... لیکن ایک صدی کے بعد اسلام اس قابل نہ رہا کہ ...." یعنی آزاد مرحوم نے یہ نہیں کہا کہ اس باب میں ان کی کوشش بارآور نہ ہوسکی ۔ یا مسلمان اس تبدیلی کے لئے تیار نہیں تھے ۔ کہا یہ کہ اسلام اس قابل نہ رہا کہ مسلمانوں کے مختلف ممالک کو محض ایمان کی بنیاد پر ایک مملکت بنا سکے ۔ یعنی ان کے نزدیک ابتداء میں کچھ وقت کے لئے تو اسلام میں صلاحیت تھی لیکن چند ہی سالوں کے بعد اس میں یہ صلاحیت نہ رہی ۔ اور اسلام کی طرف سے مایوس ہو کر "امام الہند" اپنے اس عقیدہ کا اعلان کرتے ہوئے، کانگریس میں جا ملے کہ

وقت کی ساری پھیلی ہوئی اندھیاریوں میں انسانی فطرت کا یہی ایک روشن پہلو ہے جو مہاتما گاندھی کی عظیم روح کو کبھی تھکنے نہیں دیتا ۔ (خطبہ صدارت، پرتاب گڑھ کانگریس، ۱۹۴۰ء)

سوچئے کہ جب احیاءِ اسلام کی دعوت کی ناکامی سے پیدا ہونے والی مایوسی نے، ابوالکلام آزاد (مرحوم) جیسے عالمِ دین اس قسم کی تبدیلی پیدا کر دی تھی (کہ وہ اسلام کی طرف ہی سے مایوس ہوگئے تھے) تو ہماری موجودہ کوششیں اگر ناکام رہیں تو اس کا ہماری نوجوان نسل پر کیا اثر پڑے گا ؟ یہ ہے وہ خطرہ جس کے احساس سے ہم ان تحریکات کے داعیوں کو باربار متنبہ کرتے رہتے ہیں کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ مسلمانوں کو مسلمان بناتے بناتے ہم اپنی آئندہ نسل ہی کو ہاتھ سے گنوا بیٹھیں اور ہماری حالت یہ ہو جائے کہ ـــــــ خاتمِ ہیکاں برآرم، درجگر نشتر شکست ۔

ہماری یہ کوششیں کیوں بارآور نہیں ہوتیں اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ ہم موجودہ مسلمانوں میں، اور ان اربابِ صدق و یقین میں جنہیں قرآن "مومنین" کہہ کر پکارتا ہے، فرق نہیں کرتے ۔ ہم کرتے یہ ہیں کہ (موجودہ) مسلمانوں کے سامنے اسلام کا مقصود و منتہیٰ رکھ کر، ان سے وہ توقعات وابستہ کر لیتے ہیں، جو درحقیقت "مومنین" کے ہاتھوں پوری ہوتی تھیں ۔ قرآن کریم نے بڑی تفصیل سے بتایا ہے کہ "مومنین" کی خصوصیات کیا ہوتی ہیں ۔ جن لوگوں میں وہ خصوصیات

ہوتی ہیں؛ وہ ان کے سپرد کچھ کام کرتا ہے اور وہ اسے بحسن وخوبی سرانجام دیتے ہیں۔ ان کے برعکس ہم مسلمان اس لئے مسلمان کہلاتے ہیں کہ ہم مسلمانوں کے گھر میں پیدا ہو گئے۔ ہم ان خصوصیات کے حامل نہیں جو مومنین کا خاصہ ہیں۔ اب سوچئے کہ اگر ہمارے سپرد وہ کام کر دیا جائے جسے سرانجام دینے کے اہل مومنین تھے۔ تو اس کا نتیجہ مایوسی کے سوا کیا ہوگا؟ یہ ایسے ہی ہے جیسے کسی انجینئر کے بیٹے کے، جس نے کبھی انجینئرنگ یونیورسٹی کی عمارت تک نہ دیکھی ہو، ایک عظیم عمارت بنانے کا کام محض اس لئے سپرد کر دیا جائے کہ وہ انجینئر کا بیٹا ہے، سوچئے کہ اس کا نتیجہ نقصان مایہ اور مایوسی کے سوا کیا ہوگا؟ ہمارے ساتھ ہو تو یہ رہا ہے لیکن بجائے اس کے کہ ہم اپنی اس غلطی کا اعتراف کریں کہ ہم نے وہ کام جو مومنین کے سرانجام دینے کا تھا، موجودہ مسلمانوں کے سپرد کر دیا اور ان سے وہ توقعات وابستہ کر لیں جو مومنین سے کی جانی چاہیئے تھیں، یہ تاثر عام کر دیتے ہیں کہ اسلام میں اب یہ صلاحیت ہی نہیں رہی کہ وہ، وہ نتائج پیدا کر سکے جو (کبھی) مومنین کے ہاتھوں برآمد ہوئے تھے۔ یہ ہے ہماری وہ بنیادی غلط فہمی اور غلط کوشی جو اسلام کی طرف سے مایوس ہو جانے کا موجب بن جاتی ہے۔ ہم سے تو غالب ہی اچھا تھا جسے اس کا احساس ہو گیا تھا کہ ؎

ہم کو ان سے وفا کی ہے امید ۔۔۔ جو نہیں جانتے وفا کیا ہے۔

اسے ایک مثال کی رو سے سمجھئے۔ قرآن کریم میں ہے :-

إِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ إِخْوَةٌ (۴۹/۱۰) مومن سب آپس میں بھائی بھائی ہیں

قرآن کریم نے یہ خصوصیت مومنین کی بتائی تھی۔ ہم اس ارشادِ خداوندی کو موجودہ مسلمانوں کے سامنے پیش کرتے ہیں اور توقع رکھتے ہیں کہ وہ آپس میں بھائی بھائی بن جائیں گے لیکن جب ہم دیکھتے ہیں کہ ایک مسلمان کا خنجر ہے اور دوسرے مسلمان کا سینہ، تو ہم (غیر شعوری طور پر ہی سہی) اس نتیجہ پر پہنچ جاتے ہیں کہ قرآن کا یہ دعوےٰ صحیح نہیں کہ "مسلمان سب آپس میں بھائی بھائی ہیں"۔ اگر اس کا یہ دعوےٰ صحیح ہوتا تو ایک بھائی کا خنجر دوسرے بھائی کے سینے میں کیسے پیوست ہو جاتا!

یہاں ایک اور نکتہ بھی غور طلب ہے۔ اللہ تعالیٰ نے مومنین کو حکم نہیں دیا کہ تم بھائی بھائی بن جاؤ۔ اس نے کہا ہے کہ مومنین آپس میں بھائی بھائی ہوتے ہیں۔ یعنی یہ ان کے مومن ہونے کی نشانی ہے۔ یہ ان کی خصوصیت ہے۔ جیسے یہ کہا جائے کہ شہد میٹھا ہوتا ہے۔ اگر وہ میٹھا نہیں تو شہد نہیں۔ اسی طرح مومن آپس میں بھائی بھائی ہوتے ہیں۔ وہ کون سی وجہ جامعیت ہے جس سے مومن آپس میں بھائی بھائی بن جاتے ہیں؛ اس کے متعلق فرمایا کہ یہ اعتصام بحبل اللہ (قرآن سے وابستگی) ہے جس سے فَأَصْبَحْتُم بِنِعْمَتِهِ إِخْوَانًا (۳/۱۰۲) "ان میں رشتۂ اخوت قائم ہوتا اور قائم رہتا ہے"۔

ہم کہہ یہ رہے تھے کہ ہماری غلط فہمی یہ ہے کہ ہم موجودہ مسلمانوں سے وہ توقعات وابستہ کر لیتے ہیں جو مومنین سے پوری ہوتی تھیں اور جب یہ توقعات پوری نہیں ہوتیں تو ہم اسلام کی طرف سے مایوس ہو جاتے ہیں۔ ہم (موجودہ) مسلمانوں میں اور مومنین میں کیا فرق ہے، اس کے متعلق ہم برس ہا برس سے لکھتے چلے آ رہے ہیں۔ یہاں چند ایک مثالیں دہرائی جاتی ہیں :-

(۱) ہم ہر روز دیکھتے ہیں کہ مسلمان جھوٹ بولتے ہیں، حالانکہ قرآن کریم کا ارشاد ہے کہ لَعْنَتَ اللَّهِ عَلَى الْكَاذِبِينَ (۳/۶۰) جھوٹوں پر خدا کی لعنت ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ مومنین کا شیوہ نہیں ہو سکتا۔

(۲) مسلمان ایک دوسرے کو فریب دیتے ہیں۔ تصنع، بناوٹ، چالبازی اور دھوکا دہی کی باتیں کرتے ہیں حالانکہ قرآن کا حکم ہے کہ وَاجْتَنِبُوا قَوْلَ الزُّوْرِ (۲۲/۳۰) مکر و فریب کی بنائی ہوئی جھوٹی باتوں سے اجتناب کرو۔

(۳) قرآن کا حکم ہے کہ اِذَا قُلْتُمْ فَاعْدِلُوْا (۶/۱۵۲) ہمیشہ عدل و انصاف کو ملحوظ رکھتے ہوئے بات کرو۔ اور ہم دیکھتے ہیں کہ ہمارا عمل اس کے یکسر خلاف ہوتا ہے۔

(۴) ارشادِ خداوندی ہے کہ لَا تَلْبِسُوا الْحَقَّ بِالْبَاطِلِ وَتَكْتُمُوا الْحَقَّ (۲/۴۲) نہ تو حق کو چھپاؤ اور نہ ہی حق و باطل کو گڈمڈ کرو ـــــ اور ہم روزانہ ایسا کرتے ہیں۔

(۵) قرآنِ کریم نے مومنین کا شعار یہ بتایا ہے کہ هُمْ عَنِ اللَّغْوِ مُعْرِضُوْنَ (۲۳/۳) وہ لغو باتوں سے ہمیشہ پرہیز کرتے ہیں ـــــ اور ہمارا سارا وقت لغویات میں گزر جاتا ہے۔

(۶) قرآن مجید نے کہا ہے کہ اِنَّ الَّذِيْنَ يُحِبُّوْنَ اَنْ تَشِيْعَ الْفَاحِشَةُ فِى الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ فِى الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ (۲۴/۱۹)۔ "جو لوگ اسلامی معاشرہ میں بے حیائی کی باتیں پھیلانا پسند کرتے ہیں انہیں اس دنیا میں بھی الم انگیز سزا ملنی چاہیے اور آخرت میں بھی"۔ آپ اس تعلیم کو دیکھئے اور پھر ایک نظر ڈالئے اپنے معاشرہ پر اور دیکھئے کہ ہمارے ہاں کوئی گلی، کوچہ، بازار، محفل، مجلس، تفریح گاہ، ایسی ہے جہاں فواحش کی تشہیر نہ ہوتی ہو!

(۷) خدا کا حکم ہے کہ لَا تَقْفُ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ۔ اِنَّ السَّمْعَ وَالْبَصَرَ وَالْفُؤَادَ كُلُّ اُولٰٓئِكَ كَانَ عَنْهُ مَسْئُوْلًا (۱۷/۳۶)۔ "جس بات کا تمہیں علم نہ ہو اس کے پیچھے مت لگ جایا کرو۔ یاد رکھو، تمہاری سماعت، بصارت اور قلب سے پوچھا جائے گا کہ جو بات تم نے سُنی تھی اسے آگے پھیلانے سے پہلے تحقیق کر لیا تھا کہ واقعی صحیح ہے"! آپ اس حکمِ خداوندی کو دیکھئے اور پھر ایک نظر ڈالئے اپنے معاشرہ، بالخصوص اخبارات پر اور سوچئے کہ اس حکم پر کہاں تک عمل ہو رہا ہے؟

(۸) اسلام کی تعلیم تھی کہ اَوْفُوْا بِالْعَهْدِ۔ اِنَّ الْعَهْدَ كَانَ مَسْئُوْلًا (۱۷/۳۴) ہمیشہ وعدہ پورا کرو۔ تم سے اس کے متعلق بازپرس ہوگی (کہ تم نے وعدہ کر کے اسے پورا کیا تھا یا نہیں! اور اگر نہیں کیا تھا تو کیوں؟) اس حکمِ خداوندی کو دیکھئے اور پھر اپنے طرزِ عمل پر غور کیجئے۔ کیا ہمارا طرزِ عمل اس کے مطابق ہے؟

(۹) قرآن کریم نے کہا تھا کہ اَوْفُوا الْكَيْلَ اِذَا كِلْتُمْ وَزِنُوْا بِالْقِسْطَاسِ الْمُسْتَقِيْمِ (۱۷/۳۵)۔ "جب ماپ کرو تو ماپ پورا کرو، اور جب تول کرو تو تول پورا کرو"۔ اس حکمِ خداوندی کو دیکھئے اور پھر موجودہ مسلمانوں کے بازارِ بیع و شریٰ پر نظر ڈالئے۔ کیا آپ کو وہاں اس تعلیم کا شائبہ تک بھی دکھائی دیتا ہے۔ اَوْفُوا الْكَيْلَ۔ کے معنی یہ ہیں کہ خریدار سے جو کچھ لو، اس کے بدلے میں اُسے اُس کی مطلوبہ شے خالص اور پوری پوری دو۔ کیا آپ کو ہمارے کسی بازار میں لئے دامول کے عوض خالص اور پوری پوری شے ملتی ہے؟

(۱۰) ارشادِ باری تعالےٰ ہے کہ اِعْدِلُوْا هُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى (۵/۸)۔ "ہمیشہ عدل کرو۔ کیوں کہ عدل کرنا تقوےٰ سے قریب تر ہے"۔ سوچئے کہ ہمارے معاشرہ میں یہ جنسِ گراں مایہ کہیں سے بھی دستیاب ہوتی ہے؟ واضح رہے کہ عدل سے مراد صرف عدالتی عدل نہیں۔ عدالتی عدل تو، عدل کی صرف ایک قسم ہے۔ عدل زندگی کے ہر گوشے میں مطلوب ہے۔ اور قرآن اس کا تقاضا ہر عہدِ مومن سے کرتا ہے۔ وہ تو یہاں تک کہتا ہے کہ "دشمن سے بھی عدل کرو" (۵/۸)۔ اور ہماری یہ حالت

ہے کہ دشمن تو ایک طرف، ہم دوستوں سے بھی عدل نہیں کرتے۔

(۱۱) عدل کی بنیاد، سچی شہادت پر ہے۔ قرآن کریم کا اس باب میں ارشاد ہے کہ یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْا قَوّٰمِیْنَ بِالْقِسْطِ۔ اے ایمان والو! انصاف کو ہر حال میں قائم رکھو۔ جب کسی معاملہ میں تمہاری شہادت مطلوب ہو تو تم مدعی یا مدعا علیہ کی طرف سے گواہی دینے کے لئے نہ جاؤ بلکہ شُهَدَآءَ لِلّٰهِ۔ صرف اللہ کی طرف سے گواہ بن کر جاؤ۔ اور پھر سچی سچی شہادت دو: وَلَوْ عَلٰٓى اَنْفُسِكُمْ۔ خواہ وہ شہادت خود تمہاری اپنی ذات کے خلاف ہی کیوں نہ جائے۔ اَوِ الْوَالِدَیْنِ وَالْاَقْرَبِیْنَ۔ یا تمہارے والدین یا دیگر رشتہ داروں کے خلاف کیوں نہ ہو: اِنْ یَّكُنْ غَنِیًّا اَوْ فَقِیْرًا۔ خواہ کوئی امیر ہو یا غریب، تم کسی کی طرف داری نہ کرو: فَاللّٰهُ اَوْلٰى بِهِمَا۔ ان کے مقابلہ میں خدا کا حق فائق ہے ـــــ فَلَا تَتَّبِعُوا الْهَوٰٓى اَنْ تَعْدِلُوْا۔ یاد رکھو! ایسا نہ ہو کہ تمہارے جذبات کبھی سچی بات کہنے کے راستے میں حائل ہو جائیں۔ پھر اسے بھی سن رکھو کہ وَاِنْ تَلْوٗٓا اَوْ تُعْرِضُوْا۔ فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِیْرًا (۴/۱۳۵) گواہی دیتے وقت کوئی ہیچ دار، ذومعنی بات نہ کہو۔ نہ ہی تم شہادت دینے سے پہلو تہی کرو۔ تم انسانوں سے تو ان باتوں کو چھپا سکتے ہو، لیکن خدا سے کسی بات کو چھپا نہیں سکتے۔ مؤمنین کی خصوصیت یہ ہے کہ لَا یَشْهَدُوْنَ الزُّوْرَ (۲۵/۷۲) وہ کبھی جھوٹی یا ملمع شدہ شہادت نہیں دیتے۔

یہ ہے قرآن کی رو سے مؤمنین کی صفت۔ اسے سامنے رکھئے اور پھر کچہریوں میں جائیے جہاں (خدا کے فضل سے) سب مسلمان نظر آئیں گے ـــــ اور یہ مسلمان قرآن اٹھا اٹھا کر جو شہادت دیں گے اس کے متعلق کچھ کہنے کی ضرورت نہیں!

(۱۲) قرآن کریم نے کہا تھا کہ لَا تَاْكُلُوْٓا اَمْوَالَكُمْ بَیْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ (۲/۱۸۸)۔ ایک دوسرے کا مال ناجائز طریقے سے نہ کھاؤ: وَتُدْلُوْا بِهَآ اِلَى الْحُكَّامِ لِتَاْكُلُوْا فَرِیْقًا مِّنْ اَمْوَالِ النَّاسِ بِالْاِثْمِ (۲/۱۸۸)۔ نہ ہی حکام کو رشوت دے کر دوسروں کا حق غصب کرو۔

(۱۳) آپ صبح اخبار کھولئے۔ اس کے ایک ایک صفحہ پر اس قسم کی خبریں ملیں گی کہ فلاں شخص نے دو آنے کے جھگڑے پر اپنے ساتھی کے سینے میں چھرا گھونپ دیا اور مقتول (بچے بچیاں اور بیوہ کو لاوارث چھوڑ کر) چل بسا۔ فلاں بازار میں دو پارٹیوں میں تصادم ہو گیا، اور فریقین کے دس آدمی وہیں ڈھیر ہو کر رہ گئے۔ فلاں شخص نے دن دہاڑے ایک راہ چلتی لڑکی کو اغوا کر لیا اور جس شخص نے اس معصوم کو بچانا چاہا، وہ غنڈہ اسے پستول کا نشانہ بنا کر دندناتا ہوا چلا گیا۔

یہ اس قوم کا حال ہے جس کے خدا نے ان سے کہا تھا کہ انسانی جان اس قدر گراں بہا ہے کہ ـــ مَنْ قَتَلَ نَفْسًۢا بِغَیْرِ نَفْسٍ اَوْ فَسَادٍ فِی الْاَرْضِ فَكَاَنَّمَا قَتَلَ النَّاسَ جَمِیْعًا۔ یاد رکھو! جس شخص نے کسی ایک شخص کو بھی قتل کر دیا ـــ بجز اس کے کہ اسے قتل یا بغاوت کے جرم میں سزائے موت دی گئی ہو ـــــ تو یوں سمجھو گویا اس نے پوری نوعِ انسان کو قتل کر دیا: وَمَنْ اَحْیَاهَا فَكَاَنَّمَآ اَحْیَا النَّاسَ جَمِیْعًا (۵/۳۲) اور جس نے کسی ایک بے گناہ کی بھی جان بچا دی، اس نے گویا پوری نوعِ انسانی کو زندگی عطا کر دی۔

قرآن کریم کی اس تعلیم کو سامنے رکھئے اور پھر ہمارے ہاں جو کچھ ہو رہا ہے اس پر ایک نگاہ ڈالئے۔ بات واضح ہو جائے گی۔

(۱۴) اور اس سے بھی آگے بڑھئے، اور اخبارات میں پڑھئے اس قسم کی زہرہ گداز اور جگر سوز خبریں کہ فلاں

اور فلاں مسلمان مملکتوں کی فوجوں میں گھمسان کی لڑائی ہو رہی ہے جس سے دونوں کا کافی جانی نقصان ہوا ہے۔ ظاہر ہے کہ ان فوجوں میں مرنے اور مارنے والے دونوں مسلمان ہوتے ہیں۔ وہ مسلمان جن کے خدا نے کہا تھا کہ وَمَنْ يَّقْتُلْ مُؤْمِنًا مُّتَعَمِّدًا فَجَزَآؤُهٗ جَهَنَّمُ خَالِدًا فِيْهَا وَغَضِبَ اللّٰهُ عَلَيْهِ وَلَعَنَهٗ وَاَعَدَّ لَهٗ عَذَابًا عَظِيْمًا (۴/۹۳)۔ "جس کسی نے ایک مومن کو بھی عمداً قتل کر دیا، تو اس کی سزا جہنم ہے جس میں وہ رہے گا۔ اس پر خدا کا غضب، اور اس کی لعنت ہوگی۔ اس کے لئے خدا نے سخت عذاب تیار کر رکھا ہے۔" سوچئے کہ بات کہاں جا پہنچتی ہے!

لکھنے کو تو ابھی بہت کچھ لکھا جا سکتا ہے لیکن ہم سمجھتے ہیں کہ نقطۂ پیشِ نظر کی وضاحت کے لئے اتنا ہی کافی ہے۔ اس سے آپ سوچئے کہ جو فرائض جماعتِ مومنین کے ذمے عائد کئے جاتے تھے کیا ان فرائض سے موجودہ مسلمان عہدہ برآ ہو سکیں گے؟ اور جو توقعات مومنین سے وابستہ کی جاتی تھیں انہیں ہم پورا کر سکیں گے؟ لہٰذا "احیاءِ اسلام" کی کوششوں کو بار آور بنانے کے لئے، قدمِ اوّل یہ ہے کہ موجودہ مسلمانوں کو مومن بنایا جائے ——— انجینئر کے بیٹے کو انجینئر بنایا جاتا ہے۔ اس سلسلہ میں اس حقیقت کو اچھی طرح سمجھ لینا چاہیئے کہ مسلمانوں کے گھر میں پیدا ہونے والا "مسلمان" کہلا سکتا ہے لیکن کوئی شخص پیدائشی مومن نہیں ہوتا۔ ہر شخص کو مومن بنایا جاتا ہے۔ حضور نبی اکرمؐ کے زمانے میں مومنین کی جماعت نہ تو مومن پیدا ہوئی تھی اور نہ ہی اسے کہیں سے درآمد (IMPORT) کر لیا گیا تھا۔ مومن بننے سے پہلے تو ان کی حالت ہم سے بھی ابتر تھی۔ ان کے تو پورے دور کو دورِ جاہلیت کہا جاتا ہے۔ انہیں مومن بنایا گیا تھا۔ اور اس کا طریق اور پروگرام اس کے سوا کچھ نہیں تھا کہ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ ۚ وَاِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ (۶۲/۲)۔ "رسولؐ ان کے سامنے خدا کی آیات (قرآن) پیش کرتا تھا کہ یہی ان کے دین (نظامِ حیات) کی اصل و اساس تھا ——— قرآن اور صرف قرآن پیش کرتا تھا ——— پھر انہیں ایسی تعلیم دیتا تھا جس سے وہ قوانینِ خداوندی اور ان کی غرض و غایت اور ان کے مطلوب و مقصود کو اچھی طرح سمجھ سکیں۔ اور انہیں ایسی تربیت دیتا تھا جس سے ان کی انسانی صلاحیتیں نشوونما پا جائیں۔ اس پروگرام کی رو سے وہ لوگ جو اس سے پہلے برملا غلط راستوں پر چلتے تھے، مومن بن گئے تھے۔" اور پھر ان مومنین نے وہ سب کچھ کر دکھایا تھا جسے دوبارہ دیکھنے کے لئے ہم اس قدر غلطاں و پیچاں ہیں۔

جب تک ہم اپنی نوجوان نسل کی تعلیم و تربیت کا اس قسم کا انتظام نہیں کرتے، احیاءِ اسلام کی ہماری کوئی کوشش کامیاب نہیں ہو سکتی۔ یہی ارشادِ خداوندی ہے اور یہی سنتِ نبویؐ۔

محترم پرویز صاحب کا درسِ قرآن

بزمِ طلوعِ اسلام لندن (انگلینڈ) ہر ماہ کے پہلے اتوار کو ڈھائی بجے دوپہر (بذریعہ ٹیپ)

149 SUTTON COURT RD
LONDON E-13 — 9NR.
PHONE 01 — 552-1517

لاہور میں ہر جمعہ ۸ بجے صبح (فون 880800) ۲۵/بی گلبرگ ۲ (نزد پولیس اسٹیشن)

فیصل آباد میں ہر سوموار ۷ بجے شام (بذریعہ ٹیپ) حیات سرجیکل کلینک ۲۳ پیپلز کالونی I (فون نمبر ۲۷۳۵۵)

کراچی ہر جمعہ کو ۹ بجے صبح (بذریعہ ٹیپ) کتب خانہ بزمِ طلوعِ اسلام۔ کمرہ نمبر ۲۴ ہارون چیمبرز الطاف حسین روڈ۔ نیو چالی کراچی ۲۔ فون نمبر ۲۳۸۸۲۸

گوجرانوالہ میں ہر جمعہ بجے شام (بذریعہ ٹیپ) رہائش گاہ چوہدری منظور شوکت۔ گلی روڈ سول لائنز (بالمقابل پرانا ریلوے اسٹیشن)

پشاور میں ہر جمعہ ۹ بجے صبح (بذریعہ ٹیپ) بر مکان آغا محمد یونس صاحب۔ رفیقی لین صدر۔ بالمقابل وی آئی پی مین گیٹ۔ پشاور سٹیڈیم۔ بارہ روڈ (فون ۷۳۶۵۹)

گجرات میں ہر جمعہ بعد نماز جمعہ نیز بروز اتوار ۴ بجے شام بمقام ۱۲/۱/ بی بھمبر روڈ (بذریعہ ٹیپ)

مردان میں ہر جمعہ ۵ بجے شام (بذریعہ ٹیپ) بر مکان ڈاکٹر رضا محمد خان۔ نواب شی روڈ

جلال پور جٹاں میں ہر جمعہ بعد نماز جمعہ (بذریعہ ٹیپ) دفتر بزمِ طلوعِ اسلام (بازار کلاں)

راولپنڈی میں ہر جمعہ ۵ بجے شام (بذریعہ ٹیپ) جی ۱۹۶۔ لیاقت روڈ

ملتان میں ہر جمعہ ۹ بجے صبح (بذریعہ ٹیپ) دفتر شاہ سنز بیرون پاک گیٹ۔ (فون ۳۱۰۰۱)

لیہ (بذریعہ ٹیپ) ہر جمعہ بعد نماز مغرب رہائش گاہ ڈاکٹر اظہر ملک صاحب سرکلر روڈ۔ لیہ

پنج کسی (تحصیل کبیر والا ضلع ملتان) میں ہر جمعہ (بذریعہ ٹیپ) بوقت ۳ بجے شام بمقام مطب حکیم احمد الدین صاحب نمائندہ بزم طلوع اسلام

ہنگو میں درس قرآن (بذریعہ ٹیپ) ہر جمعہ شام ساڑھے پانچ بجے بر مکان محمد جمیل حسن صاحب ٹل روڈ ہنگو۔ فون نمبر ۷۶

کراچی کے خریدار متوجہ ہوں!

کتب خانہ کے اوقاتِ کار حسبِ ذیل ہیں
ہر روز علاوہ جمعہ:- شام ۲ بجے تا ۸ بجے شب
جمعہ:- صبح ۹ بجے تا ۱۲ بجے دوپہر

نیز کتب خانہ میں ادارہ طلوعِ اسلام کی مطبوعات بھی دستیاب ہیں اور ایک کارڈ تحریر کر کے منگوائی بھی جاسکتی ہیں۔

محمد اسلام۔ کتب خانہ بزمِ طلوعِ اسلام
کمرہ نمبر ۲۴۔ ہارون چیمبرز
الطاف حسین روڈ نیو چالی
کراچی ۲
(فون نمبر ۲۳۸۸۲۸)

حرفِ دل

فلاطوں طفلکے باشد بہ یونانے کہ من دارم
مسیحا رشک می آرد بہ درمانے کہ من دارم

زِ کفرِ من چہ می خواہی زِ ایمانم چہ می پرسی
ہماں یک جرعۂ عشق است ایمانے کہ من دارم

خدا دارم دِلے بریاں زِ عشقِ مصطفےٰ دارم
نہ دارد ہیچ کافر ساز و سامانے کہ من دارم

فلک یک مطلعِ خورشید دارد با ہمہ شوکت
ہزاراں مطلع ہا دارد گریبانے کہ من دارم

زِ برہاں تا بہ ایماں سنگ ہا دارد رہِ واعظ
نہ دارد ہیچ واعظ ہمچو برہانے کہ من دارم

سید اسعد نعمان

باسمہٖ تعالیٰ

یومِ سرسیّد کی تقریب پر پرویز صاحب کا خطاب

۲۴ مئی ۱۸۷۵ء

(جب پاکستان کی پہلی اینٹ رکھی گئی)

برادرانِ عزیز ! سلام ورحمت ۔

مدینہ میں مسلمانوں کی اپنی پہلی آزاد اسلامی مملکت قائم ہو جانے کے بعد انہیں ان کی سابقہ حالت کی یاد اس طرح کرائی گئی تھی؛ وَاذْكُرُوا إِذْ أَنتُمْ قَلِيلٌ ۔ تم اپنی اس حالت کو یاد کرو جب تم تعداد میں بہت کم تھے۔ مُّسْتَضْعَفُونَ فِي الْأَرْضِ ۔ اور اتنے کمزور و ناتواں تھے کہ مخالفین تمہیں کسی خاطر میں نہیں لاتے تھے ۔ تَخَافُونَ أَن يَتَخَطَّفَكُمُ النَّاسُ ۔ نامساعدت حالات کی وجہ سے تمہیں ہر وقت دھڑکا لگا رہتا تھا کہ دشمن کہیں تمہیں اُچک کر نہ لے جائیں ۔ فَآوَاكُمْ ۔ ضعف و ناتوانی ، بے کسی و بے چارگی اور خوف و ہراس کے اس لرزہ انگیز عالم کے بعد خدا نے تمہیں ایک محفوظ مقام میں پناہ دی ۔ وَأَيَّدَكُم بِنَصْرِهِ ۔ اور اپنی تائید و نصرت سے تمہارے لئے قوت کا سامان پیدا کر دیا ۔ وَرَزَقَكُم مِّنَ الطَّيِّبَاتِ ۔ اور نہایت فراوانی سے تمہیں خوشگوار رزق عطا کیا ۔ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ ۔ (۸:۲۶) تاکہ زندگی کے ان بلند مقاصد کے حصول کے لئے جو تمہارا منتہائے نگاہ تھا ، تمہاری کوششیں بھرپور نتائج پیدا کر سکیں ۔

۱۸۵۷ء کے بعد مسلمانوں کی حالت

۱۸۵۷ء کے سانحہ ہوشربا کے بعد مسلمانانِ ہند کی حالت بعینہٖ یہی (بلکہ اس سے بھی بدتر) ہو چکی تھی ۔ ان کی سلطنت لٹی ، دولت و حشمت تباہ ہوئی ۔ عزت و ناموس کو غارت کیا گیا ۔ ان کے اہنائے قوم کو چن چن کر قتل کیا گیا ۔ ان کی متاعِ زندگی میں کوئی شے محفوظ نہیں تھی ۔ خوف و ہراس ان پر چاروں طرف سے طاری تھا اور انہیں امید کی کوئی کرن کہیں سے دکھائی نہیں دیتی تھی ۔ ایک طرف انگریز جس کے سینے میں صلیبی جنگوں کے زخم ہمیشہ تازہ رہتے ہیں یہ تہیہ کئے بیٹھا تھا کہ مسلمان کو اس برصغیر میں اس طرح ختم کیا جائے کہ ان کا جداگانہ تشخص تک باقی نہ رہے ۔ دوسری طرف ہندو؛ ان سے اپنی ہزار سالہ غلامی کا انتقام لینے کے لئے

دانت ہیں رہا تھا۔ اس نے حسبِ عادت مسلمانوں کے خلاف ہر قسم کے سچے جھوٹے الزامات لگا کر انگریز کو بھڑکانا شروع کر دیا۔ اس سلسلہ میں "لائل محمڈنز اوف انڈیا" میں سرسید لکھتا ہے:-

> اس وقت کوئی آفت ایسی برپا نہیں ہوئی جس کے متعلق یہ نہ کہا گیا ہو کہ اسے مسلمانوں نے برپا کیا ہے خواہ وہ کسی رام دین یا ماتا دین ہی نے کیوں نہ برپا کی ہو۔ کوئی بلا آسمان سے نہیں آئی جس نے سب سے پہلے مسلمان کا گھر نہ تاکا ہو۔ کوئی کانٹوں والا درخت اس زمانے میں نہیں اگا جس کی نسبت یہ نہ کہا گیا ہو کہ اسے مسلمانوں نے بویا ہے۔ کوئی آتشیں بگولا نہیں اٹھا جس کے متعلق یہ نہ مشہور کیا گیا ہو کہ اسے مسلمانوں نے اٹھایا ہے۔

قرآنِ کریم نے بنی اسرائیل کے اس قسم کے حالات کا ذکر کرنے کے بعد کہا تھا کہ وَنُرِيدُ أَن نَّمُنَّ عَلَى الَّذِينَ اسْتُضْعِفُوا فِي الْأَرْضِ۔ ہم نے چاہا کہ اس قوم کو جسے اس بری طرح سے کچلا گیا تھا اپنے احسانات

اس قوم پر احسان

سے نوازیں۔ وَنَجْعَلَهُمْ أَئِمَّةً۔ انہیں ذلت و پستی کے گڑھوں سے نکال کر اقوامِ عالم کی امامت کے منصب پر سرفراز کر دیں۔ وَنَجْعَلَهُمُ الْوَارِثِينَ۔ وَنُمَكِّنَ لَهُمْ فِي الْأَرْضِ (۲۸:۶) انہیں فرعون کی مملکت (کے ایک حصہ) کا مالک بنا کر ملک میں اقتدار و حکومت عطا کر دیں۔ اس مقصد کے لئے ان میں صاحبِ ضربِ کلیم حضرت موسیٰؑ کو مبعوث کیا گیا۔

نبوت کا سلسلہ نبی اکرمؐ کی ذاتِ گرامی کے ساتھ ختم ہو گیا۔ اس لئے اب اس قسم کے عظیم انقلابات کے لئے حضرات انبیاء کرام علیہم السلام کی بعثت نہیں ہو سکتی۔ اب یہ محیر العقول تغیرات ان انسانوں کے ہاتھوں رونما ہوں گے جو خدا کے نازل کردہ ضابطہ قوانین (قرآن کریم) سے بصیرت حاصل کر کے قوم کی راہ نمائی صحیح منزل کی طرف کریں۔ اس مقصد کے لئے، ان یاس انگیز اور مرگ آفریں حالات میں جن کی طرف اوپر اشارہ کیا گیا ہے، ہندی مسلمانوں کو حیاتِ نو عطا کرنے کے لئے ایک بطلِ جلیل پیدا ہوا جو دنیا میں سرسیدؒ کے نام سے متعارف ہوا۔

سرسیدؒ کی نمود

سرسیدؒ کوئی "مامور من اللہ" نہیں تھا۔ نہ ہی اس نے اس قسم کا کوئی دعویٰ کیا۔ وہ عام انسانوں کی طرح پیدا ہوا۔ عام انسانوں کی زندگی جیا۔ لیکن کام وہ کر گیا جس نے ایک دنیا کو ورطۂ حیرت میں ڈال دیا۔ جب مولانا حالیؔ نے سرسیدؒ کے سوانح حیات مرتب کرنے کا ارادہ کیا تو سرسیدؒ سے اس کی زندگی کے متعلق پوچھا۔ اس کے جواب میں سرسیدؒ نے جو کچھ کہا وہ اس کی بلندئ کردار کی زندہ شہادت ہے۔ اس نے کہا۔

> میری لائف میں اس کے سوا کہ لڑکپن میں خوب کبڈیاں کھیلیں، کنکوے اڑائے، کبوتر پالے، ناچ مجرے دیکھے اور بڑے ہو کر نیچری کافر اور بے دین کہلائے اور رکھا ہی کیا ہے۔

یاد رکھئے۔ یہ بات اس وقت کہی گئی تھی جب سرسیدؒ کی عظمت کا شہرہ ساری دنیا میں پھیل چکا تھا اور ان

۱؎ ان کا نام سید احمد خان تھا اور سر (SIR) حکومت کی طرف سے عطا کردہ خطاب۔ لیکن ان کے نام کے یہ دونوں لاحقے اس طرح ہم آغوش ہوئے کہ ان کا نام ہی سرسیدؒ مشہور ہو گیا۔

کے ہاتھوں کا لگایا ہوا پودا ، جھوراباز بکھر بکھر کر پھل دے رہا تھا - اُس وقت ایسا اعتراف وہی عظیم انسان کر سکتا ہے جسے مبداءِ فطرت نے خلوص و دیانت کی نعمت سے نوازا اور انتہائی کشادہ نگہی اور فراخ حوصلگی کی دولت سے سرفراز کیا ہو - یہ کسی مصنوعی لیڈر کے بس کی بات نہیں ہو سکتی - مصنوعی لیڈر تو اپنے آپ کو پیدائشی ولی کہا کرتے ہیں -

برادرانِ عزیز ! اس وقت میرے پیشِ نظر سرسید کے سیاسی کارنامے ہیں نہ مذہبی اصلاحات - نہ اس کی معاشرتی خدمات ہیں نہ ادبی تعمیرات - میں اس وقت صرف یہ بتانا چاہتا ہوں کہ سرسید نے اس تاریکیوں میں گھری ہوئی قوم کے مستقبل کے متعلق کیا سوچا اور اسے کس طرح ایک زندہ جاوید عملی پیکر عطا کیا - سب سے پہلے اس نے دیکھا کہ مسلمانوں کے خلاف "بغاوت" کا الزام لگا کر انہیں ہر قسم کے ظلم و استبداد اور جور و تشدد کا تختۂ مشق بنایا جا رہا ہے - اس کے لئے اپنا مشہور رسالہ "اسبابِ بغاوتِ ہند" لکھ کر ہندوستان

اسبابِ بغاوتِ ہند

اور انگلستان کے سیاسی حلقوں میں تہلکہ مچا دیا - ۱۸۵۷ء کے ہیبت ناک ماحول میں یہ جراتِ رندانہ کتنے مہیب خطرات کو دعوت دینے کے مترادف تھا اس کا اندازہ گورنمنٹ آف انڈیا کے اس وقت کے فارن سیکرٹری (مسٹر بیڈن) کے ان الفاظ سے لگایئے جو اس کے سینے کے جوشِ غیظ و غضب کے غماز ہیں - اس نے کہا تھا :-

> اِس شخص نے نہایت باغیانہ مضمون لکھا ہے - اس سے حسبِ ضابطہ فوراً باز پرس کی جائے اور اگر کوئی معقول جواب نہ دے سکے تو سخت سزا دی جائے -

اور یہ بات شائد آپ کو معلوم نہ ہو کہ سرسید اُس وقت خود حکومت کی ملازمت میں تھا - ملازمِ حکومت اور حکومت بھی "غدر" کے زمانے کی ! لیکن اس کی جراتِ بے باک اپنا کام کر گئی - چنانچہ انگلستان کے مشہور اخبار جوم نیوز نے اس رسالہ پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا :-

> سرسید نے انتہائی دلیری سے اپنی رائے کا اظہار کیا ہے اور یہ بات محتاجِ بیان نہیں کہ اس کی اس جراتِ رندانہ رائے نے حکمران طبقہ کو بے حد متاثر کیا ہے -

۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی سے بہت پہلے پنجاب اور سرحد میں سید احمد بریلوی (علیہ الرحمۃ) کے زیرِ قیادت جہاد کی ایک تحریک سرگرمِ عمل تھی جو عوام میں "وہابی تحریک" کے نام سے مشہور تھی - "غدر" کے بعد انگریز اور ہندو کو بہانہ ہاتھ آ گیا - جو مسلمان ان کی نگاہوں میں کھٹکتا اس کے متعلق کہہ دیتے کہ وہ "وہابی" ہے اور اس کے بعد اسے حوالۂ دار و رسن کر دیتے - چنانچہ کسی بڑے سے شہر اور قریہ میں کوئی ایسا درخت نہیں تھا جس پر ان "وہابیوں" کی لاشیں تڑپتی اور لٹکتی دکھائی نہ دیتی ہوں - بے گناہ لوگوں کے اس خونِ ناحق سے سرسید کا خون کھول گیا - کافی سوچ بچار کے بعد وہ اس نتیجہ پر پہنچا کہ اس آگ کو ٹھنڈا کرنے کے لئے اس کے سوا کوئی تدبیر نہیں کہ اس میں خود کود جائے - چنانچہ اس نے ہندوستان ہی میں نہیں بلکہ انگلستان کے پارلیمنٹ کے ایوان تک میں اپنا یہ نعرہ پہنچا دیا کہ

> اگر وہابی ہونا کوئی جرم ہے تو سن رکھو کہ سب سے بڑا وہابی میں ہوں -

جب سرسید کے ان جراءت مندانہ اقدامات سے مسلمانوں کے اس طرح بے محابا قتل و غارت گری کا سیلاب تھم گیا تو اسے ان کے مستقبل کی فکر لاحق ہوئی۔ وہ ان کی غصب شدہ جائدادیں اور لٹی ہوئی دولتیں انہیں واپس نہیں دلانا چاہتا تھا۔ وہ انہیں ان کی عظمتِ رفتہ کا مالک بنانا چاہتا تھا۔ اس نے یہ معلوم کرنے کے لئے کہ قوموں کی نشاۃ ثانیہ کا راز کیا ہے، اپنے او پر دن کا چین اور راتوں کی نیند حرام کر لی۔ تا آنکہ یہ حقیقت بے نقاب ہو کر اس کے سامنے آ گئی کہ ؎

جہانِ تازہ کی افکارِ تازہ سے ہے نمود!
کہ سنگ و خشت سے ہوتے نہیں جہاں پیدا!

حیاتِ تازہ کی تدبیر

اس نے اس حقیقت کو پا لیا کہ قوم کی حیاتِ تازہ کے لئے اس کے سوا کوئی چارہ کار نہیں کہ اس میں ایسے انسان پیدا کئے جائیں جو ان فرسودہ راستوں کو چھوڑ کر جہاں سے قوم کے جنازے قبرستانوں تک پہنچے تھے۔ اپنی جدتِ فکر اور ندرتِ عمل سے نئی راہیں تراشیں جو کاروانِ ملت کو ان کی منزلِ مقصود تک لے جائیں۔ اس نے تاریخ عالم کا بالعموم، اور مسلمانوں کی تاریخ کا بالخصوص گہری نظر سے مطالعہ کیا اور اس نتیجہ پہ پہنچا کہ یہ قوم جو صدیوں سے ذلت و پستی کے غاروں میں جہنم کی زندگی بسر کر رہی ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ ایک گہری سازش کے تحت اس قوم کی عقل و فکر کی صلاحیتیں مفلوج کر کے رکھ دی گئی ہیں۔ ان کے علم و بصیرت کے چراغ گل ہو چکے ہیں۔ ان کے شعور و تدبر کی شمعیں بجھ دی گئی ہیں۔ اور جب ان میں غور و فکر کی صلاحیت ہی نہیں رہی تو یہ فطرت کی قوتوں کو مسخر کیسے کر سکتی ہے۔ اس نے فطرت کی قوتوں (FORCES OF NATURE) کی اہمیت پر اس قدر زور دیا کہ وہ "نیچری" کے لقب سے پکارا جانے لگا اور پھر ...... اس کے مخالف علماء نے نیچری کو الحاد و بےدینی کے مترادف قرار دے کر اس پر کفر کے فتوے عائد کر دیئے۔ نوبت یہاں تک پہنچ گئی کہ جو شخص ذرا عقل و بصیرت کی بات کرتا، اس کے متعلق کہہ دیا جاتا کہ وہ "نیچری" ہے لہٰذا، ملحد و بےدین۔

قوم کی ذلت و پستی کے اسباب پر نظری طور پر غور کرنے کے بعد اس نے جب ہندوستان میں بسنے والی ہمسایہ قوم پر نگاہ ڈالی تو اس نے دیکھا کہ اُس قوم نے اس راز کو پا لیا ہے کہ زندہ قوموں کی صف میں کھڑا ہونے کے لئے علومِ حاضرہ کی تحصیل ناگزیر ہے۔ اس کا نتیجہ یہ تھا کہ "بغاوتِ ہند" کے ایک ہی سال بعد

ہندو کی مسابقت

(یعنی ۱۸۵۸ء میں) کلکتہ، بمبئی، اور مدراس میں جدید علوم کی یونیورسٹیاں قائم ہو گئی تھیں، جن میں ہندو جوق در جوق داخل ہو رہے تھے لیکن مسلمانوں کے علماء کرام نے فتویٰ دے رکھا تھا کہ انگریزی پڑھنا حرام ہے اس لئے مسلمان اسے شجرِ ممنوعہ سمجھ رہا تھا۔ نتیجہ یہ کہ بیس سال کے عرصہ میں صرف بیس مسلمان گریجوایٹس ہو سکے ...... ان یونیورسٹیوں سے نکلے ہوئے غیر مسلم حکومت کی مشینری میں دخیلِ کار ہوتے جا رہے تھے اور مسلمانوں نے اپنے آپ پر اس کے دروازے بند کر رکھے تھے۔ سرسید نے اس صورتِ حالات کا گہری نظر سے جائزہ لیا اور ۱۸۶۳ء میں جب کہ وہ غازی پور میں تعینات تھے، "سائنٹیفک سوسائٹی" کی بنیاد رکھ دی جس کا اوّلین مقصد یہ تھا کہ عصرِ حاضر کے علوم سے

سائنٹفک سوسائٹی متعلق جو کتابیں انگریزی زبان میں شائع ہوں ان کا اُردو میں ترجمہ کیا جائے تاکہ مسلمان ان علوم سے واقفیت حاصل کریں اور اس کے بعد ان کے دل میں خود ان علوم کی تحصیل کا شوق بیدار ہو۔

اس کے بعد سرسیّد نے دوسرا قدم اٹھایا اور غازی پور میں جدید خطوط پر ایک مقامی مدرسے کی داغ بیل ڈالی۔ سرسیّد کے دل میں علم کی عظمت کا احساس کس قدر شدید تھا اس کا اندازہ اس دُعا سے لگایا جا سکتا ہے جو اس مدرسے کا سنگِ بنیاد رکھتے وقت ان کے لبوں پہ آگئی تھی۔ انہوں نے انتہائی رقّتِ قلب کے ساتھ کہا:۔

سرسیّد کی دُعا اے خدا! ہم میں روز بروز علم کی کمی اور جہالت کی تاریکی کی ترقی ہوتی جاتی تھی۔ تو نے ہمارے دلوں کو پھیرا کہ ہم علم کی روشنی پھیلانے پر مستعد ہوئے۔ بیشک سب کے دل تیری انگلیوں میں ہیں۔ جس طرف تو چاہتا ہے پھیر دیتا ہے۔ ہم سب تیرا شکر ادا کرتے ہیں کہ تو نے ہمارے دلوں کو ایسے کاموں کی طرف پھیرا جو نہ صرف ہمارے ہی لئے مفید ہیں بلکہ ہمارے بعد جو بہت سی نسلیں آنے والی ہیں ان کے لئے بھی ایک روشنی ہے ۔۔۔۔۔۔

اے خدا! تو خوب جانتا ہے کہ یہ مدرسہ جس کا پتھر آج ہم نے تیرے نام پہ رکھا ہے' تیری مخلوق کے فائدے کے لئے رکھا ہے' تو اپنے فضل سے اپنے نام پر اسے قبول فرما اور جیسا کہ تو نے خوبی سے اس کا آغاز کیا ہے۔ اسی طرح بخیر اس کا انجام کر۔ ربنا تقبل منا انک انت السمیع العلیم۔

جب سرسیّد غازی پور سے تبدیل ہو کر علی گڑھ آئے تو سائنٹفک سوسائٹی بھی ان کے ساتھ علی گڑھ منتقل ہو گئی۔ یہاں پہنچ کر انہوں نے سوسائٹی کا اخبار ـــــ علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ جاری کیا اور اس طرح علوم جدید کی اہمیت اور افادیت کا چرچا دور دور تک ہونے لگا۔

لیکن یہ کوشش ابتدائی اور مقامی سی تھی۔ مسلمانوں کے اجتماعی مستقبل کے متعلق سرسیّد جو کچھ سوچ رہا تھا اس کا عملی پروگرام ہنوز اس کے ضمیر کی گہرائیوں میں پہلو بدل رہا تھا۔ وہ مسلمانوں کی تعلیم کو عالمگیر نہیں تو کم از کم ملک گیر حیثیت دینا چاہتا تھا۔ لیکن وہ ایک عملی انسان تھا۔ وہ اپنے سرِ نظریے کے لئے ذاتی معلومات اور تجربہ حاصل کرنا ضروری سمجھتا تھا۔ عصرِ حاضر کی تعلیم کا مرکز اور سرچشمہ اس زمانے میں یورپ ہی تھا، اس لئے سرسید نے فیصلہ کیا کہ وہ یورپ جا کر اپنی آنکھوں سے دیکھے کہ اس تعلیم کا نہج اور طریق کیا ہے؟ اس زمانے میں یورپ کا سفر آسان بات نہیں تھا۔ سب سے بڑا مسئلہ اخراجات کا تھا۔ اس مقصد کے لئے اس نے اپنے کتب خانے

یورپ کا سفر کو بیچا۔ کوٹھی کو رہن رکھا اور سفر کی تیاری کی۔ مولانا حالی کا بیان ہے کہ جب ہم لوگ ان صعوباتِ سفر اور مالی مشکلات کا ذکر کرتے تو وہ کہتے کہ یہ سب بجا اور درست ہے لیکن "میرا مقصد پورا نہیں ہو سکتا جب تک میں بذاتِ خود اصول و طرزِ تعلیم سے واقفیت نہ حاصل کر لوں"۔ چنانچہ وہ اپنے دونوں بیٹوں سمیت اپریل سنہ ۱۸۶۹ء میں یورپ کی طرف روانہ ہو گئے۔ اس سفر میں انہوں نے جو کچھ دیکھا کس نگاہ سے دیکھا، اس کے متعلق وہ خود لکھتے ہیں :۔

میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ جب میں نے کوئی عمدہ چیز دیکھی۔ جب کبھی عالموں اور مہذب لوگوں

کو دیکھا۔ جب کبھی علمی مجلسیں دیکھیں۔ جہاں کہیں عمدہ مکانات دیکھے۔ جب کبھی عمدہ پھول دیکھے۔ جب کبھی کھیل کود عیش و آرام کے جلسے دیکھے۔ یہاں تک کہ جب کوئی خوبصورت شخص دیکھا تو مجھ کو ہمیشہ اپنا وطن اور اپنی قوم یاد آئی اور نہایت رنج ہوا کہ ہماری قوم ایسی کیوں نہیں؟ جہاں تک ہوسکا ہر موقعہ پر میں نے مسلمانوں کی ترقی کی تدبیروں پر غور کیا۔

سب سے اوّل یہی تدبیر سوچی کہ قوم کے لئے قوم ہی کے ہاتھوں ایک مدرسۃ العلوم (کالج) قائم کیا جائے۔

واپسی

سرسیدؒ سفرِ یورپ کے اس ماحصل کو اپنے قلب و نگاہ کے دامن میں سمیٹ کر، اکتوبر ۱۸۷۰ء میں واپس ہندوستان پہنچا۔ یہاں پہنچتے ہی اس نے ایک کمیٹی بنائی جس کا نام تھا "خواستگارِ ترقیٔ تعلیم مسلمانان" اور جس کا فریضہ یہ تھا کہ وہ تحقیق کرے کہ مسلمان تعلیم میں پیچھے کیوں ہیں؟

تعلیم کے متعلق گفتگو کرتے وقت کچھ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اس مسئلہ کا تعلق انسان کے ذہن سے ہے اور اس کی مشکلات انتظامی سی۔ لیکن سرسید کے نزدیک اس مسئلہ کی نوعیت اس سے بالکل مختلف تھی۔ اس کے لئے یہ مسئلہ اس کی زندگی کا جزو اور ایمان کا تقاضا بن چکا تھا جس کا تعلق ذہن کے علاوہ انسان کے نازک ترین جذبات سے بھی ہوتا ہے۔ اس باب میں سرسیدؒ کے جذبات کی شدت کا کیا عالم تھا اس کا اندازہ آپ اس واقعہ سے لگائیے جسے سرسید کے قریب ترین رفیق، نواب محسن الملک نے بیان کیا ہے:۔

نالۂ نیم شبی

خواستگارِ ترقی تعلیم کی کمیٹی کے پہلے اجلاس میں شرکت کی غرض سے نواب محسن الملک جلسہ کے انعقاد کی تاریخ سے ایک دن پہلے پہنچ گئے اور سرسیدؒ کے ہاں ہی قیام کیا۔ وہ لکھتے ہیں:۔

> رات کو سرسیدؒ نے میرا پلنگ بھی اپنے کمرے میں بچھوایا تھا۔ گیارہ بجے تک مسلمانوں کی تعلیم کے متعلق باتیں ہوتی رہیں۔ اس کے بعد میری آنکھ لگ گئی۔ دو بجے کے قریب میری آنکھ کھل گئی تو میں نے سرسیدؒ کو اپنے پلنگ پر نہ پایا۔ میں انہیں دیکھنے کے لئے کمرے سے باہر نکلا۔ دیکھتا کیا ہوں کہ برآمدے میں ٹہل رہے ہیں اور زار و قطار روتے جاتے ہیں۔ میں نے گھبرا کر پوچھا کہ کیا خدانخواستہ کہیں سے کوئی افسوسناک خبر آئی ہے؟ یہ سن کر اور زیادہ رونے لگے۔ اور کہا کہ اس سے زیادہ اور کیا مصیبت ہوسکتی ہے کہ مسلمان بگڑ گئے اور بگڑتے جارہے ہیں۔ اور کوئی صورت ان کی بھلائی کی نظر نہیں آتی۔ میری ساری رات اس اُدھیڑبن میں گذر گئی ہے کہ دیکھئے کل جلسہ کا انجام کیا ہوتا ہے اور کسی کے کان پر جوں چلتی ہے یا نہیں۔
>
> نواب محسن الملک کہتے ہیں کہ سرسیدؒ کی یہ حالت دیکھ کر جو کیفیت میرے دل پر گزری اس کو بیان نہیں کرسکتا اور جو عظمت اس شخص کی اس دن سے میرے دل میں بیٹھی ہوئی ہے اُس کو میں ہی جانتا ہوں۔

فکر و نظر کا وہ عالم کہ اصول و طریق تعلیم سے واقفیت حاصل کرنے کے لئے قرض اٹھا کر یورپ کا سفر اختیار کرتے ہیں اور سوز و گداز کی یہ کیفیت کہ اس غم میں راتیں رو رو کر گزار دیتے ہیں کہ مسلمان بگڑتے جارہے ہیں اور

ان کے سنبھلنے کی کوئی صورت نظر نہیں آتی۔

اس کمیٹی نے ابتدائی تحقیق کے سلسلے میں بڑا کام کیا۔ بڑے بڑے اہل الرائے حضرات سے مشورے کئے۔ سارے ملک سے تجاویز مانگیں۔ اشتہارات شائع کئے۔ مضامین لکھوائے۔ جلسے کئے۔ چندہ جمع کیا۔ رپورٹیں مرتب کیں اور اس ملک گیر مہم کے بعد وہ اس نتیجہ پر پہنچا کہ علی گڑھ کو جدید تعلیم کا مرکز قرار دے کر کام کی ابتداء کر دی جائے خواہ وہ کتنے ہی چھوٹے پیمانے پر کیوں نہ ہو۔ چنانچہ طے پایا کہ سب سے پہلے ایک ماتحت مدرسہ کا اجراء کر کے اہلِ ملک کو نمونہ دکھایا جائے کہ ہمارے پیشِ نظر مقصد کیا ہے۔ چنانچہ اللہ کا نام لے کر ۲۴ مئی ۱۸۷۵ء کو اس مدرسہ کی بنیاد رکھ دی گئی۔ یہ ایک مدرسہ کی بنیاد نہیں تھی بلکہ جیسا کہ میں آگے چل کر عرض کروں گا، یہ درحقیقت پاکستان کی پہلی اینٹ تھی۔ اس مدرسہ کا آغاز کس بے مائیگی کے عالم میں ہوا تھا اس کا اندازہ اس سے لگائیے کہ جب یکم جون ۱۸۷۵ء

ابتدائی مدرسہ کی تاسیس

کو کلاسس شروع ہوئی تو اس میں طلباء کی تعداد سات تھی! (ساٹھ نہیں سات) اور ماہوار بجٹ -/۹۸۹ روپے۔ پہلے ہیڈ ماسٹر کا مشاہرہ چالیس روپے تھا۔ اس کے بعد سرسید نے محسوس کیا کہ اب ملازمت میں رہتے ہوئے کام کرنے سے بات نہیں بنے گی۔ اب مجھے سارا وقت اس تحریک کے لئے وقف کر دینا چاہیئے۔ چنانچہ انہوں نے ۱۸۷۶ء میں پنشن لے کر علی گڑھ کو مستقل طور پر اپنا مسکن بنا لیا۔

اس مقام پر اتنا اور عرض کر دینا بے محل نہ ہوگا کہ سرسید کی بیوی کا انتقال ۱۸۶۱ء میں ہو گیا تھا جب سرسیدؒ کی عمر چوالیس سال کی تھی۔ انہوں نے اس کے بعد شادی نہیں کی تاکہ گھر کے جھمیلوں سے آزاد رہ کر اپنی پوری زندگی اس مقصد کے لئے فارغ رکھی جائے۔ مقصد سے عشق اسے کہتے ہیں۔

* * *

چندہ کی مہم

سب سے پہلا مرحلہ اس درس گاہ کے لئے عمارات کا تعمیر کرنا تھا اور چونکہ اسکیم یہ تھی کہ اسے کالج اور پھر یونیورسٹی تک لے جایا جائے گا، اس لئے عمارات کی سکیم وسیع پیمانے پر تیار ہوئی تھی۔ اس کے لئے کافی روپے کی ضرورت تھی جو پبلک کے چندے ہی سے مہیا ہو سکتا تھا۔ اس کے لئے سرسید جھولی بغل میں ڈال کر چل نکلا اور ملک کے کونے کونے میں پہنچا۔ لوگوں سے ایک ایک پیسہ بھیک کے طور پر مانگا۔ اس کے لئے وہ کوئی گوشہ چھوڑتے ہی نہیں تھے۔ پٹیالہ گئے تو معلوم ہوا کہ وزیرِ ریاست کے ہاں پوتا پیدا ہوا ہے۔ اس کی خوشی میں عام رسم کے مطابق "چراغی" کے پانچ روپے مانگنے کے لئے چلے گئے ——— جس پر انہوں نے ایک معقول رقم نذر کر دی۔ ان کے ایک دوست دور دراز سفر سے علی گڑھ آئے۔ آپ اس سے ملنے گئے تو کہا کہ میں سید ہوں، امام ضامن کا روپیہ مانگنے آیا ہوں۔ ان سے اشرفی لے کر ٹلے۔ دوستوں کا حلقہ بڑا وسیع تھا۔ جہاں جاتے وہ دعوت کرتے۔ دعوت قبول کر لیتے۔ لیکن بعد میں کہہ دیتے کہ بابا! جو کچھ میری ضیافت پر خرچ کرنا ہے مجھے نقد دے دو۔ ان سے نقد لے لیتے اور روٹی اپنی گرہ سے کھا لیتے۔ اس زمانے کے لکھے ہوئے ایک آرٹیکل میں کہتے ہیں:-

ہمارا تو اب یہ حال ہو گیا ہے کہ ہمارے دوست بھی اب ہم سے ملتے ہوئے ڈرتے ہیں کہ کچھ سوال

نہ کر بیٹھیں۔ ہماری صورت ہی اب سوال ہو گئی ہے۔

ایک دن اپنے ایک قدیم دوست سے چندہ کا تقاضا کیا تو انہوں نے بدمزہ ہو کر کہا کہ صاحب! ہم تو چندہ دیتے دیتے تھک گئے۔ سرسید نے کہا کہ ارے میاں! جب کوئی دن میں ہم مر جائیں گے پھر کون تم سے چندہ مانگے گا؟ یہ الفاظ کچھ اس طور پہ ادا کیئے گئے کہ دونوں آبدیدہ ہو گئے اور چندہ فوراً دے دیا گیا۔

انہوں نے اپنی دوستی اور رشتہ داری کے تعلقات تک کو کالج کے لیئے چندہ کے ساتھ مشروط کر دیا تھا چنانچہ ایک بار اپنے بچپن کے ایک نہایت گاڑھے دوست کو جو ذی استطاعت تھے لیکن کالج کے کچھ سرگرم معاون نہیں تھے۔ صاف کہلا بھیجا کہ مدرسہ کی مالی مدد کے بغیر ہماری دوستی قائم نہیں رہ سکتی۔

اور طریقوں سے روپیہ کی فراہمی

چندہ مانگنے کے علاوہ انہوں نے بےشمار اور طریقوں سے بھی روپیہ اکٹھا کیا۔ کبھی اپنے دوستوں کی کتابیں بیچ کر روپیہ پیدا کیا۔ کبھی علی گڑھ کی نمائش میں کتابوں کی دکان لگائی اور خود کتابیں بیچنے کے لیئے دکان پہ بیٹھے۔ کبھی اپنی تصویر کی کاپیاں فروخت کر کے پیسے جمع کیئے اور ایک بار اس سلسلے میں وہ کچھ کیا جس کا ذکر تو ایک طرف تصور تک سے ہر حساس انسان محوِ حیرت رہ جاتا ہے۔ بات یوں ہوئی کہ غریب طالبعلموں کو وظائف دینے کے لیئے روپے کی ضرورت پیش آئی جو کسی طریق سے فراہم نہ ہو سکا۔ سرسیدؒ نے مجبور ہو کر ایک تماشے کا اہتمام کیا۔ اس پہ دوستوں نے منع کیا کہ ایسا نہ کیجئے۔ لوگ مطعون کریں گے۔ اخبارات میں ہنسی اُڑائی جائے گی۔ سرسید نے کہا کہ اگر میں لوگوں کے کہنے کا خیال کرتا تو جو کچھ اب تک کیا ہے اس میں سے کچھ بھی نہ ہو سکتا۔ لوگوں کے کہنے کا کچھ بھی خیال نہ کرو بلکہ یہ دیکھو کہ اس سے درحقیقت قوم کو فائدہ پہنچے گا یا نہیں۔ چنانچہ تماشا دیکھنے کے لیئے لوگ جمع ہو گئے تو سرسید خود اسٹیج پہ کھڑے ہو گئے اور انہوں نے ایک مؤثر تقریر کی اور کہا:-

> کون ہے جو آج مجھ کو اسٹیج پہ دیکھ کر حیران ہوتا ہوگا؟ وہی جن کے دل میں قوم کا درد نہیں۔ وہی جن کا دل جھوٹی شیخی اور جھوٹی مشیخت سے بھرا ہوا ہے۔ آہ! اس قوم پر جو شتر مناک باتوں کو اپنی شیخی اور افتخار کا باعث سمجھے اور جو کام قوم اور انسان کی بھلائی کے لیئے کیئے جائیں ان کو بے عزتی کے کام سمجھے۔ آہ اس قوم پر جو لوگوں کو دھوکہ دینے کے لیئے مکر دینداری کے کالے سوت سے بُنے ہوئے تقدس کے برقعے کو اپنے منہ پر ڈالے ہوئے ہوں مگر بدصورتی اور دل کی بُرائی کا کوئی علاج نہ سوچیں۔ آہ اس پر جو اپنی قوم کو نکبت و ذلت کے سمندر میں ڈوبتا ہوا دیکھے اور خود کنارے پہ بیٹھا ہنستا رہے۔ اپنے گھر میں کھلے خزانے ایسی بےشرمی اور بےحیائی کے کام کریں جن سے بےشرمی اور بےحیائی بھی شرما جائے۔ لیکن قوم کی بھلائی کے کام کو شرم اور نفرین کا کام سمجھے۔

کہتے ہیں سامعین میں سے کسی منچلے نے کہا کہ آپ اسٹیج پہ خود غزل گا کر سنائیں تو ہم چندہ دیں گے۔ اس پہ سرسید نے گا کر غزل سنائی اور چندہ وصول کر لیا۔

غور فرمایئے! ایک ستر اسی سال کا بوڑھا۔ عالمگیر شہرت کا مالک بھاری بھرکم انسان اور اسٹیج پہ غزل گا رہا ہے! کاہے کے لیئے؟ تاکہ مدرسے کے غریب طالب علموں کے وظیفے کا انتظام ہو جائے ——

خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را

چندہ جمع ہوا۔ مدرسہ یکم جنوری ۱۸۷۸ء کو کالج میں تبدیل ہو گیا۔ کالج کی عمارات تعمیر ہو گئیں۔ ایسی عمارات کہ انہیں دیکھ کر ایک ایرانی سیاح بے اختیار پکار اٹھا۔

واللہ معجزہ می نماید۔ کاریکہ از سلطنت بر نیاید چگونہ از یک فردِ رعیت سرانجام شد

کفر کے فتوے

سرسید اس ٹکی پٹی قوم کی باز آفرینی کے لئے یہ کچھ کر رہا تھا اور ہمارے علمائے کرام اس کے پیچھے کفر کا ڈنڈا لئے پھر رہے تھے۔ جب سرسیدؒ نے مدرسہ کی بنیاد رکھی تو ایک مولوی صاحب نے فتویٰ صادر کر دیا کہ

جو لوگ مدرسۃ العلوم قائم کرنا چاہتے ہیں وہ درحقیقت مسلمان نہیں۔

جب سرسیدؒ کی کوششیں کچھ اور آگے بڑھیں تو دہلی سے ایک مفتی صاحب (مولوی کریم اللہ) اٹھے اور انہوں نے فتویٰ دے دیا کہ

ایسے ناپاک کا نام مدرسہ رکھنا اور محلِ تعلیم و تحصیل سمجھنا آدمیت سے نکلنا ہے اور زمرہ حیوانیت میں داخل ہونا ہے۔ بالکل عاطل بلکہ صَرف کرنا مال کا ایسے محل میں موجب گندہ ہونا جہنم اور ایسے بے محل میں مساعی ہونا ہیمہ اور حطب بننا لازم۔ الحاصل معاونت ایسے غارتِ ایمان اور مال کی اور بللہ سمجھنا اپنے مال کا خیالِ خام ہے۔ نے نے یوں سمجھو کہ اپنے ہاتھ سے جہنم میں مکان تعمیر کرنا ہے۔

فرنگی محل (لکھنؤ) کے مولوی عبدالحئی صاحب آگے بڑھے اور فرمایا:-

یہ شخص مخربِ دین اور ابلیسِ لعین کے وسوسے سے صورتِ اسلام میں تخریبِ دینِ محمدی کی فکر میں ہے۔

حرمین سے فتوے منگائے گئے

جب یہاں کے فتوے سے جی نہ بھرا تو دوڑے دوڑے مکہ معظمہ پہنچے اور وہاں سے مفتیانِ مذاہبِ اربعہ کا فتویٰ حاصل کیا جس میں لکھا تھا:-

یہ شخص ضال اور مضل ہے بلکہ ابلیس لعین کا خلیفہ ہے اس کا فتنہ یہود و نصاریٰ کے فتنے سے بھی بڑھ کر ہے۔ خدا اس کو سمجھے۔

اس سے بھی آگے بڑھے تو مدینہ منورہ پہنچے اور وہاں سے یہ فتویٰ حاصل کیا کہ

یہ شخص یا تو ملحد ہے یا شرع سے کفر کی جانب مائل ہو گیا ہے۔ پس اگر اس شخص نے گرفتاری سے قبل توبہ کر لی اور ان گمراہیوں سے رجوع کر لیا تو قتل نہ کیا جائے ورنہ اس کا قتل واجب ہے۔ دین کی حفاظت کے لئے اگر اس کا مدرسہ بن جائے تو اس کا منہدم کر دینا واجب ہے۔

سرسید ملک کے گوشے گوشے میں جھولی تھیلی میں ڈالے امتِ مرحومہ کے تحفظ کے لئے بھیک مانگتا پھرتا اور ہمارے

یہ حامیانِ دینِ متین اور منبر دارانِ شرعِ مبین اس کے پیچھے فتاویٰ کا پلندہ لئے پھرتے تھے۔ جہاں اس کا لیکچر ہوتا شور مچا دیا جاتا۔ لوگوں کو مشتعل کر کے فساد کرا دیا جاتا۔ چندہ دینے والوں کو گھیر گھیر کر روک دیا جاتا۔ عوام کو اس کے قتل کے لئے اکسایا اور بھڑکایا جاتا۔ اسے آئے دن قتل کی دھمکیوں کے خطوط اور پیغام ملتے رہتے۔ سفر اور حضر میں اس کے لئے خطرے کے سامان پیدا کئے جاتے۔

آپ کو معلوم ہے کہ یہ کون تھا جسے دینِ محمدی کا حریف اور ابلیسِ لعین کہا جاتا تھا۔ سنئے برادرانِ عزیز! یہ کون تھا۔

سر ولیم میور کی کتاب کا جواب

سر ولیم میور یو پی کا گورنر تھا۔ آج کا نہیں؛ اُس زمانے کا گورنر اور اس صوبے کا گورنر جس میں سر سید سرکاری ملازمت میں تھا۔ اس نے حضور سرورِ کائنات کی سیرت پر ایک کتاب لکھی جس میں نبی اکرمؐ کی ذاتِ اقدس و اعظم پر ناروا حملے کئے۔

یہ تمام محافظینِ دینِ متین اپنے اپنے حجروں اور خانقاہوں میں بیٹھے دین کی حفاظت کر رہے تھے اور سارے ملک میں ایک یہ کافر و ملحد ہی تنہا تھا جس نے سر ولیم میور کو چیلنج دیا اور کہا کہ دیکھو! میں تمہارے اعتراضات کی قلعی کس طرح کھولتا ہوں؟ جب سر سید نے جواب لکھنے کی ٹھانی تو دیکھا کہ اس کے لئے کافی مواد موجود نہیں۔ متعلقہ کتابیں انگلستان میں مل سکتی ہیں۔ وہ جب تعلیمی مشاہدہ کے لئے انگلستان گیا ہے تو اس پروگرام کو بھی اپنے ساتھ لے گیا اور لندن کے کتب خانوں میں بیٹھ کر سر ولیم میور کی کتاب کا جواب لکھا۔ کتاب مرتب ہو گئی تو اس کے چھپوانے کے لئے پیسے نہیں تھے۔ اس پر قریب چار ہزار روپے لاگت آتی تھی۔ اس نے اپنی کتابیں، گھر کا سامان، کھانے پکانے کے برتن بیچ کر، سود پر قرض لے کر، اپنے گہرے دوستوں سے بھیک مانگ کر بڑی مصیبت کے ساتھ یہ روپیہ فراہم کیا اور اس کتاب کو چھپوایا۔ اس زمانے میں نواب محسن الملک کو اپنے ایک خط میں لکھتے ہیں:-

> چاہے میں محتاج، فقیر، بھیک مانگنے کے قابل ہو جاؤں۔ مگر کتاب ضرور چھپواؤں گا تاکہ جب قیامت کے دن میرا نام پکارا جائے تو خدا فرمائے کہ "سید احمد" کو بلاؤ جو اپنے نانا کے نام پر فقیر ہو گیا۔

سارا روپیہ ختم ہو گیا اور سر سید کے پاس ولایت سے واپس آنے کا کرایہ تک نہ رہا۔ معلوم اس نے کس طرح اس کا انتظام کیا۔ یہ تھا وہ "کافر و ملحد" جس کے خلاف مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ تک سے فتوے منگائے جاتے تھے۔ یہ تو خیر پھر بھی ناموسِ رسالتؐ پر مرمٹنے کا سوال تھا۔ سر سید کی حمیتِ دینی کی شہادت تو روزمرہ کے چھوٹے چھوٹے واقعات تک دیتے تھے۔ ایک دفعہ ان کے ایک مخلص دوست (غالباً نواب وقار الملک) کا واسطہ ایک ایسے عیسائی افسر سے پڑا جو دفتر کے اوقات میں نماز پڑھنے پر معترض تھا۔ انہوں نے ایک خط میں

سر سید کی دینی حمیت

اس بات کی اطلاع سر سید کو دی اور اُن سے مشورہ طلب کیا۔ سر سید نے خط ملتے ہی انتہائی غم و غصہ کے عالم میں انہیں لکھا:-

> آج خط ملا اور حال معلوم ہوا۔ گو میں کسی وقت کی نماز پڑھ لیتا ہوں اور کسی وقت کی نہیں پڑھتا اور وقت بے وقت کا بھی خیال نہیں کرتا۔ دو دو اکٹھی ملا کر پڑھ لیتا ہوں ...... یہ سب باتیں مجھ میں ہیں اور نالائقی اور شامتِ اعمال سے ایسی سستی نماز میں ہے۔ لیکن تم نے اس معاملہ میں جو ہیٹی

آیا نہایت لچرپن کیا۔ نماز جو خدا کا فرض ہے اس کو ہم اپنی شامت اعمال سے جس خرابی سے ہو ادا کریں یا قضا کریں لیکن اگر کوئی شخص یہ کہے کہ نماز نہ پڑھو تو اس کا صبر ایک لمحہ بھی نہیں ہو سکتا۔ یہ بات سنی بھی نہیں جا سکتی۔ میری سمجھ میں نماز نہ پڑھنا صرف گناہ ہے جس کے بخشے جانے کی توقع ہے۔ لیکن کسی شخص کے منع کرنے سے نہ پڑھنا اور سستی میں ڈالنا میرے نزدیک کفر ہے جو کبھی نہ بخشا جائے گا۔ تڑاق سے استعفیٰ دے دینا تھا اور کہہ دینا تھا کہ میں اپنے خدائے عظیم الشان و قادر مطلق کی اطاعت کروں گا نہ کہ آپ کی ؟ کیا ہوتا ؟ نوکری میسر نہ آتی۔ فاقے سے مرجاتے۔ نہایت اچھا ہوتا۔ والسلام

یہ تھا وہ مردِ غیور جس کے خلاف کفر اور الحاد کے فتوے شائع کئے جاتے تھے۔ اس نے تمام فتووں کا جواب ایک شعر میں دے دیا ـــــ سُنیئے کہ وہ کس سوز و گداز اور تپش و خلش سے کہتے ہیں :-

خدا دارم - دلے بریاں زعشقِ مصطفیٰ دارم　　　نہ دارد ہیچ کافر سازو سامانے کہ من دارم

سرسید نے کفر کے ان فتووں کے جواب میں کسی کو گالی نہیں دی، کسی پر غصہ کا اظہار نہیں کیا۔ لیکن جو کچھ کہا وہ اصولی طور پر ایسا ہے کہ اس قسم کے فتووں کے جواب میں جو ان حضرات کی طرف سے ہر زمانے میں ہر اس شخص کے خلاف صادر ہوتے رہتے ہیں جو کسی بات میں بھی اُن سے اختلاف رکھتا ہو۔ پورے اعتماد کے ساتھ پیش کیا جا سکتا ہے۔ انہوں نے لکھا۔

فتووں کا جواب

ہم کو ملحد، زندیق اور لامذہب کہنا کچھ تعجب نہیں ہے۔ کیونکہ ہماری قوم نے خدائے ذوالجلال کے سوا، باپ دادا کے رسم و رواج کو، اور اپنے قدیمی چال چلن کو دوسرا خدا مانا ہے۔ اور پیغمبرِ آخرالزماں محمد رسول اللہ کے سوا اور بہت سے پیغمبر پیدا کئے ہیں۔ کتاب اللہ کے سوا انسانوں کی بنی ہوئی بہت سی کتابوں کو قرآن بنایا ہے۔ اور ہم اس جھوٹے خدا اور فرضی پیغمبروں اور جعلی قرآنوں کو ایسا ہی برباد کرنے والے ہیں جیسے ہمارے جدِّ امجد ابراہیمؑ اپنے باپ آذر کے بُت توڑنے والے تھے۔ ہم سچے خدائے ذوالجلال اور سچے پیغمبر محمد رسول اللہ کی نبوت اور سچی کتاب اللہ کی اطاعت دنیا میں قائم کرنا چاہتے ہیں۔ پھر وہ لوگ ہم کو ملحد و زندیق و لامذہب نہ کہیں اور نہ سمجھیں تو کیا کہیں اور کیا سمجھیں۔ کیونکہ ہم ان کے خداؤں اور پیغمبروں اور قرآنوں کو نہیں مانتے۔

جہاں تک ان کی اپنی ذات کا تعلق تھا وہ کفر و الحاد کے ان فتووں سے اثر نہیں لیتے تھے۔ لیکن جب یہ حضرات کالج کے لئے چندہ کے راستے میں روک بن کر کھڑے ہو جاتے تھے تو اس سے سرسید کو بہت دکھ ہوتا تھا ـــــ کس قدر دکھ ہوتا تھا اس کا اندازہ ان کی اس تقریر کے چند فقروں سے لگائیے جو انہوں نے لاہور میں اس وقت کی جب وہ کالج فنڈ کے لئے پنجاب کا دورہ کر رہے تھے اور مولوی صاحبان ان کے پیچھے لٹھ لگی لئے پھر رہے تھے۔ انہوں نے اس عظیم اجتماع سے خطاب کرتے ہوئے کہا۔

لاہور میں خطاب

اے بزرگانِ پنجاب! میں فرض کرتا ہوں کہ میں بدعقیدہ ہوں۔ مگر میں آپ سے پوچھتا ہوں کہ اگر ایک کافر و مرتد آپ کی قوم کی بھلائی کے لئے کوشش کرے تو کیا آپ اسے اپنا خادم، اپنا خیر خواہ نہیں سمجھیں گے؟ آپ کے دولت سرا بنانے میں جس میں آپ آرام فرماتے ہیں اور آپ کے بچے پرورش پاتے ہیں، آپ کے لئے مسجد بنانے جس میں آپ خدائے واحد ذوالجلال کا نام پکارتے ہیں۔ چوہڑے، چمار، قلی، کافر، بت پرست اور بدعقیدہ سب ہی مزدوری کرتے ہیں۔ مگر آپ نہ کبھی اس دولت خانہ کے دشمن ہوتے ہیں نہ کبھی اس مسجد کے منہدم کرنے پر آمادہ ہوتے ہیں۔ پس آپ مجھ کو بھی اس مدرسۃ العلوم کے قائم کرنے میں ایک قلی، چمار کی مانند تصور کیجئے اور میری محنت اور مشقت سے اپنے نئے گھر بننے دیجئے اور اس وجہ سے کہ اس کا بنانے والا یا اس میں مزدوری کرنے والا ایک قلی چمار ہے اپنے گھر کو مت ڈھائیے۔ کیا آپ صاحب مجھ بدبخت، نامۂ سیاہ کی شامتِ اعمال سے اپنی قوم کو اور ان کی اولاد کو نسلاً بعد نسلاً ڈبوتا اور خراب و خستہ حالت میں ڈالنا چاہتے ہیں؟ اگر آپ صاحب میری حالت کو بدتر جانتے ہو تو اس سے عبرت پکڑو لیکن بجائے خدا اپنی قوم کی، اپنی اولاد کی بھلائی اور بہتری کی تو فکر کرو۔

مولانا حالیؔ کا بیان ہے کہ سرسید کے منہ سے یہ الفاظ نکل رہے تھے اور سامعین پر سکتہ کا عالم طاری تھا۔ کوئی مسلمان ایسا نہ تھا جو زار و قطار نہ رو رہا ہو اور جو اپنی بساط سے زیادہ چندہ دینے پر آمادہ نہ ہو۔ جلوت ہی میں نہیں؛ وہ خلوت میں بھی ایسے مخالفین کے خلاف دشنام طرازی پر نہیں اترتے تھے۔ اور اپنی کیفیت قلب کا اظہار کرتے تھے تو نہایت دل دوزی اور جگر سوزی کے ساتھ۔ مثلاً وہ اپنے ایک دوست کو خط میں لکھتے ہیں:۔

> افسوس خدا ہاتھ نہیں آتا۔ جناب رسول اللہ موجود نہیں۔ ورنہ ان میں سے ایک ایک کا ہاتھ پکڑ کر ان کے سامنے لے جاتا اور کہتا کہ اے خدا! اے جناب رسولِ خدا! حکم کرو تم مجھ میں اور ان میں اور بتاؤ کہ تمہارا دوست دار آخر کون ہے۔ میں گنہگار یا یہ دیندار؟ اور انشاءاللہ اگر خدا سچ ہے اور قیامت درست ہے تو یہ معرکہ ہو کر رہے گا۔

لیکن جب علماء حضرات کی طرف سے عائد کردہ کفر کے فتوے اور جھوٹا پراپیگنڈہ کامیاب نہ ہوا تو انہوں نے ایک عملی قدم اٹھایا اور علی گڑھ کالج کے بالمقابل ایک دارالعلوم کی بنیاد رکھ دی۔ اس کا نام انہوں نے خالص دینی تعلیم کا مرکز رکھا اور علی گڑھ کالج کو الحاد اور بے دینی کی نشرگاہ قرار دیا۔ علی گڑھ بھی ایک تحریک تھی اور اس کے علی الرغم یہ دارالعلوم بھی ایک تحریک تھی۔ اس وقت اس تحریک کے مقاصد اور ماحصل کے متعلق کچھ نہیں کہنا چاہتا کیونکہ میرا موضوع "علی گڑھ" ہے۔

کالج کے نتائج

ان حضرات کی مخالفتوں کے باوجود کالج بن گیا اور اس کے نتائج برآمد ہونے شروع ہو گئے۔ جیسا کہ میں نے پہلے بھی عرض کیا ہے۔ کلکتہ، مدراس اور بمبئی میں ۱۸۵۸ء میں کالج کھل گئے تھے۔ جہاں ہندوؤں نے بکثرت داخلے لینا شروع کر دیئے تھے اور مسلمانوں سے کہا جا رہا تھا کہ

انگریزی پڑھنا حرام ہے۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ ۱۸۷۵ء تک جب مدرسہ علی گڑھ کی بنیاد رکھی گئی ملک میں قریب ساڑھے آٹھ سو ہندو گریجوایٹس تھے اور صرف بیس مسلمان۔ علی گڑھ کالج (فرسٹ ائیر) ۱۸۷۸ء میں کھلا اور اس کے بیس سال بعد (جب سرسید کی وفات ہوئی) ملک میں ۱۲۶ مسلمان گریجوایٹس تھے اور ۱۷۴ انڈر گریجوایٹس تھے۔ اس کالج نے اتنا ہی نہیں کیا بلکہ اس دیوار کو گرا دیا جو مسلمانوں کے اور علوم عہدِ حاضرہ کے درمیان کفر کا ہوا بن کر حائل تھی۔ نتیجہ یہ کہ ملک میں دیگر مقامات (مثلاً لاہور، امرتسر، کراچی، حیدرآباد، بھاولپور وغیرہ) میں مسلمانوں کے اسکول اور کالج کھلنے شروع ہو گئے۔ اس کا نتیجہ یہ تھا کہ جہاں ۱۸۸۲ء تک ملک میں صرف ۴۳ مسلمان گریجوایٹس تھے ۱۸۹۳ء تک ان کی تعداد ۲۳۹ تک پہنچ گئی تھی۔ ۱۸۹۳ء سے ۱۸۹۸ء تک صرف الہ آباد اور پنجاب میں ان کی تعداد ۱۸۵ تھی۔ عام تعلیم کی یہ حالت تھی کہ بنگال میں ۱۸۸۲ء میں کالجوں اور اسکولوں میں ایک لاکھ پچاسی ہزار مسلمان تھے اور ۱۸۹۶ء میں ان کی تعداد چار لاکھ نوے ہزار تک پہنچ گئی۔ یہ نتیجہ تھا ایک مردِ خدا اندیش و دیدہ ور کی دور نگہی اور جرأت آموزی کا۔

جہانے را دگرگوں کرد یک مردِ خود آگاہے

میں برادرانِ عزیز! یہ کچھ کہہ رہا ہوں اور چشمِ تصور سے ان خیالات کو بھی سامنے لا رہا ہوں جو آپ کے دل میں گذر رہے ہیں کہ اگر سرسید کی ان کوششوں سے دو چار سو مسلمان لڑکے گریجوایٹس بن گئے تھے تو یہ کون سا ایسا معرکہ آرا کارنامہ ہے جس سے اسے قوم کا محسنِ اعظم سمجھ لیا جائے۔ یہ ٹھیک ہے کہ آج کے حالات کے ساتھ

اس کا دُور رس نتیجہ

مقابلہ کرنے سے یہ بات ایسی معرکہ آرا نظر نہیں آتی۔ لیکن سرسید کی ان کوششوں کی صحیح اہمیت و عظمت کا اندازہ کرنے کے لئے دو باتوں کو پیشِ نظر رکھئے۔ سب سے پہلے یہ کہ، بات دو چار سو یا دو چار ہزار مسلمان گریجوایٹس پیدا کرنے کی نہیں تھی۔ اصل بات اُس آہنی دیوار کے توڑنے کی تھی جسے قدامت پرست طبقہ کے غلط تصورات نے مسلمانوں اور علوم عصرِ حاضر کے درمیان کھڑا کر رکھا تھا۔ سرسید کی بصیرتِ قرآنی نے یہ حقیقت اس کے سامنے بے نقاب کر دی تھی کہ جب تک انسان فطرت کی قوتوں کو مسخر نہ کرے وہ مومن تو ایک طرف صفِ آدمیت میں کھڑے ہونے کے قابل بھی نہیں ہو سکتا۔ اور فطرت کی قوتوں کو مسخر کرنے کے لئے قوانینِ فطرت (لاز آف نیچر) کا مطالعہ لاینفک ہے۔ سرسیدؒ نے اس قرآنی اصول پہ اس شد و مد سے زور دیا اور اصرار و تکرار سے نیچر، نیچر کا اعادہ کیا کہ (جیسا کہ میں نے شروع میں کہا ہے) وہ نیچری مشہور ہو گیا۔ اور نیچر کی اہمیت سے بے خبروں نے اسے اس پر ملحد اور بے دین قرار دے دیا۔ اس میں شبہ نہیں کہ اس باب میں سرسید کے ذہن نے بعض مقامات پہ غلطیاں بھی کیں لیکن غلطیاں ہر پاؤنیر (سابقِ اوّل) سے ہوتی ہیں۔ بایں ہمہ آپ سوچئے کہ اگر سرسید علومِ فطرت کے اس دروازے کو مسلمانوں کے سامنے نہ کھولتا تو آج ہم کس مقام پہ کھڑے ہوتے اور اقوامِ عالم میں ہمارا کیا حشر ہوتا؟ دوسری بات یہ سامنے رکھئے کہ سرسیدؒ کی نگاہِ دور رس نے بھانپ لیا تھا کہ ہندوستان کی سیاست کا مستقبل کیا ہونے والا ہے۔ اس نے دیکھ لیا تھا کہ انگریز مجبور ہوگا کہ حکومت کی مشینری میں اہلِ ہند کو کسی نہ کسی شکل میں شریک کرے۔ اور اس شرکت کے لئے علومِ مغرب سے واقفیت لازمی تھی۔ چنانچہ ابھی سرسید کو آنکھ بند کئے تھوڑا سا عرصہ ہی گزرا تھا کہ اس

کے اس اندازے نے عملی شکل اختیار کرنی شروع کر دی۔ حکومت نے کونسل میں ہندوستانیوں کی نمائندگی کا فیصلہ کیا۔ اور اب یہ مسئلہ زیرِ غور آیا کہ اس میں شرائطِ انتخاب کیا ہوں۔ ہندوؤں کا مطالبہ تھا کہ یہ انتخاب مخلوط ہونا چاہیئے۔ سرسید نے ۱۸۷۵ء میں کہا تھا کہ ہندوستان میں ایک قوم نہیں بستی۔ مسلمان اور ہندو دو الگ الگ قومیں بستی ہیں۔ سرسید کے جانشین نواب محسن الملک نے انتخاب کے اس سوال کو اٹھایا اور قوم کے قریب ستر نمائندگان پر مشتمل ایک وفد لے کر گورنر جنرل کے پاس پہنچا۔ ہندوستان کی سیاست میں یہ پہلا موقعہ تھا جب مسلمانوں نے اپنے حقوق کے تحفظ کے لئے اس قسم کا قدم اٹھایا تھا۔ یہ کیا تھا؟ محض سرسید کی ان کوششوں کا نتیجہ کہ مسلمان کو مغربی تعلیم سے بے بہرہ نہیں رہنا چاہیئے۔ اس جدوجہد نے آگے چل کر مسلمانوں کی جداگانہ تنظیم کی شکل اختیار کی اور ۱۹۰۶ء میں آل انڈیا مسلم لیگ کا وجود عمل میں آیا جس کے جائنٹ سیکرٹری علی گڑھ تحریک کے روحِ رواں نواب محسن الملک اور وقار الملک تھے۔ لیگ کا صدر مقام بھی علی گڑھ ہی تھا۔ یہی وہ تنظیم تھی جو آگے بڑھتے بڑھتے تحریکِ پاکستان کی صورت اختیار کر گئی اور ۱۹۴۷ء میں یعنی سرسید کی وفات کے قریب پچاس سال

حصولِ پاکستان

بعد ـــــ مسلمانوں کی جداگانہ مملکت کے حسین پیکر میں نمودار ہوئی۔ ذرا سوچئے کہ اگر اُس وقت سرسید ہمت سے کام نہ لیتا اور مسلمانوں پر انگریزی پڑھنا اور مغربی علوم حاصل کرنا بدستور حرام رہتا تو اس برصغیر میں مسلمانوں کی وکالت کرنے والا بھی کوئی مل سکتا؟ اس تحریکِ آزادی میں وہی لوگ پیش پیش تھے جو یا تو علی گڑھ کے پروردہ تھے یا سرسید کی تعلیمی تحریک کے تحت قائم شدہ دیگر اداروں کے پیداکردہ ـــــ اگر سرسیدؒ یہ کچھ نہ کر جاتا تو نہ محمد علی ہوتا نہ شوکت علی، نہ اقبالؒ ہوتا نہ جناحؒ اور ہم آج ہندوستان میں شودروں کی سی زندگی بسر کر رہے ہوتے۔ اس نقطۂ نگاہ سے دیکھئے تو سرسیدؒ ہی درحقیقت پاکستان کا معمارِ اوّل ہے جس نے اس مملکت کی پہلی اینٹ اس دن رکھی تھی جب اس نے علی گڑھ مدرسہ کا افتتاح کیا تھا یعنی ۲۴ مئی ۱۸۷۵ء کی مبارک و مسعود تاریخ کو۔ آج سے ایک سو پانچ سال پہلے!

مدرسۃ العلوم کی تعلیم سے سرسیدؒ کے پیشِ نظر کیا تھا اس کا اندازہ ان کے چند فقروں سے لگائیے جن سے انہوں نے ایک دفعہ اپنے طلباء سے خطاب کیا تھا۔ انہوں نے کہا تھا:-

مسلمان طلباء

یاد رکھو۔ سب سے سچا کلمہ لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ ہے۔ اس پر یقین رکھنے کی بدولت ہماری قوم، ہماری قوم ہے۔ اگر تم نے سب کچھ کیا اور اس پر یقین نہ کیا تو تم ہماری قوم نہ رہے۔ پھر اگر تم آسمان کے ستارے بھی ہو گئے تو کیا؟ مجھے امید ہے کہ تم علم اور اسلام دونوں کے نمونے ہو گے اور جبھی ہماری قوم کو حقیقی عزت نصیب ہوگی۔

سرسید کے زیرِ تربیت جو نوجوان اس کالج سے نکلے ان کے دل میں قوم کی محبت اور اسلام کا درد کس حد تک تھا اس کے لئے ان کی زندگی کی عملی شہادت ہمارے سامنے ہے لیکن ان میں ارکانِ اسلام کی ادائیگی کے سلسلہ میں ڈسپلن کا کیا عالم تھا اس کا اندازہ اس ایک واقعہ سے لگائیے جسے صدقِ جدید لکھنؤ کے مدیر نے ان الفاظ میں بیان کیا تھا:-

اذان کی آواز پر

غالباً ۱۸۹۸ء کا ذکر ہے۔ سرسیدؒ کی وفات یا تو ہو چکی تھی۔ یا عنقریب ہونے کو تھی۔ علی گڑھ کی شہرت کرکٹ کے میدان میں ہندوستان گیر ہو چکی تھی

> کہ ایک کرکٹ میچ سول سروس والوں سے مقابلہ نینی تال میں قرار پایا۔ میچ شروع ہوا اور اتفاق سے جمعہ کا دن تھا اور سول سروس ٹیم کھیل رہی تھی اور علی گڑھ کھلا رہی تھی۔ علی گڑھ کے شہرۂ آفاق باؤلر اشفاق باؤلنگ کر رہے تھے۔ بس ایک مرتبہ جو اشفاق نے گیند پھینکنے کے لئے ہاتھ اٹھایا کہ اسی سیکنڈ نمازِ جمعہ کی اذان کی آواز کان میں آئی اور معاً بلا توقف اس کا اٹھا ہوا ہاتھ نیچے گر گیا۔ اشفاق نے اتنا بھی نہ کیا کہ بولنگ ہی پوری کر لیتا۔ سول سروس والے اس پابندیٔ احکام پر عش عش کر اٹھے۔

یہ تھے "بے دین اور نیچری" سرسید کی درس گاہ کے تعلیم و تربیت یافتہ نوجوان!

کالج بڑھتا گیا۔ سرسیدؒ کے ہاتھوں کے لگائے ہوئے پودے نے جھولیاں بھر بھر کر پھل دینے شروع کر دیئے۔ کہ عین اس وقت وہ سانحہ پیش آیا جو دنیا کے ہر عظیم انسان کے ساتھ اس وقت پیش آتا ہے۔ جب اس کی شہرت نصف النہار تک پہنچ جاتی ہے۔ چرچل نے ایک جگہ یہ بتانے کے بعد کہ جو لوگ عظمت کی بلندیوں پر پہنچتے ہیں ان میں کیا خوبیاں ہوتی ہیں۔ کہا ہے کہ

> یہ عظمت بہت کم انسانوں کے حصے میں آتی ہے اور ان کے ساتھ بھی یہ بیتتی ہے کہ انہیں کبھی کمتر درجے کے انسانوں کا جذبۂ حسد اور بے اعتمادی ستاتا ہے۔ اور کبھی انہیں دوسروں کی حماقتوں اور غلطیوں کا خمیازہ بھگتنا پڑتا ہے۔

اپنوں کی طرف سے مخالفت

بعینہٖ یہی کچھ سرسید کے ساتھ ہوا۔ سرسید نے جب دیکھا کہ اس کی عمر بیتی جا رہی ہے تو اس نے فیصلہ کیا کہ کالج کے نظم و نسق کو اپنے ہاتھ میں رکھنے کے بجائے قوم کے معتمد علیہ لوگوں کے ہاتھ میں دے دیا جائے۔ اس کے لئے اس نے ایک بورڈ آف ٹرسٹیز کی تجویز کی اور ایک کوڈ (ضابطہ) مرتب کیا اور تمام ممبروں کے پاس رائے کے لئے بھیجا۔ خان بہادر مولوی سمیع اللہ سرسید کے قدیمی دوست اور ایک معنی میں دستِ راست تھے۔ انہوں نے اس کوڈ کی بعض دفعات سے اختلاف کیا۔ بات معمولی تھی۔ کوڈ، کمیٹی کے اجلاس میں اکثریت کی آراء سے پاس ہو گیا۔ اب اس اختلاف کو ختم ہو جانا چاہیئے تھا۔ لیکن خان بہادر نے اسے ذاتی سوال بنا لیا اور سرسید کی مخالفت شروع کر دی۔ اس مہم میں کچھ اور لوگ بھی اس کے شریک ہو گئے۔

اگرچہ سرسید چالیس سال سے مسلسل مخالفتیں جھیلتے چلے آ رہے تھے اور ان سے ان کے عزم و حوصلہ اور ثبات و استقامت پر کوئی اثر نہیں پڑا تھا بلکہ ان کا جذبۂ عمل تیز سے تیز تر ہوتا چلا گیا تھا۔ لیکن وہ مخالفت بیگانوں کی طرف سے تھی۔ اب جو خود اپنوں کی طرف سے یہ طرزِ عمل سامنے آیا اور وہ بھی اس انداز کا کہ وہ محض حسد کی وجہ سے اسے ذاتیات تک کھینچ کر لے گئے تو بالآخر۔

دل ہی تو ہے نہ سنگ و خشت درد سے بھر نہ آئے کیوں؟

سرسید کے دل پر اس سے سخت چوٹ لگی اور اس نے ان کی صحت پر بڑا برا اثر ڈالا۔ بایں ہمہ وہ مردِ جری

اسی بلند حوصلگی کے ساتھ آگے بڑھتا چلا گیا۔ لیکن صحت کی کمزوری، عمر کی زیادتی، کام کی کثرت ان سب نے مل کر اس شاہ بلوط کو گرا لیا اور ۲۷ مارچ ۱۸۹۸ء کی شب یہ بطلِ جلیل ایک خرمنِ مراد اپنے آغوش میں لئے اس دنیا سے رخصت ہو گیا۔ اس کے مرنے کے بعد اس کا صندوق کھولا گیا تو اس میں سے صرف پانچ روپے نکلے۔ چنانچہ اس کے کفن کا انتظام بھی اس کے دوستوں نے کیا۔ سرسید کی وفات پر ہندوستان ہی میں نہیں دنیا کے مختلف حصوں میں تعزیت کے جلسے منعقد ہوئے اور بڑے بڑے مشہور لوگوں نے سوگواری کے پیغامات بھیجے۔ میں اس وقت ان میں سے صرف ایک مرتبہ آپ کے سامنے پیش کروں گا جسے لندن کی ایک مشہور خاتون نے لکھا تھا۔ اس کا ترجمہ یہ ہے:-

ایک تناور درخت جہاں کھڑا تھا وہیں گر پڑا۔ اس کی سایہ دار شاخیں چاروں طرف دور دور تک جھومتی تھیں اور صحت بخش شبنم ان سے ٹپکتی تھی۔ انہوں نے کثرت سے بیج بکھیرے اور ان کے سائے میں بنجر زمین میں حیاتِ تازہ کی نمود ہو گئی۔

بیج پھوٹ نکلے، شگفتہ و شاداب پھول کھلنے لگے، اور خوبصورت پھولوں نے، جو حسن اور توانائی سے آراستہ تھے، اس ویران ریگستان کو گلزار بنا دیا۔ اب اشک بہاؤ اس شاہانہ درخت کے لئے کہ اجل نے اسے گرا دیا۔

غم کرو ـــ لیکن امید کے ساتھ ـــ کیونکہ وہ سرسبز و شاداب کھیتیاں جو اس کی عرق ریزیوں کا ثمر ہیں، اس کے مزار کے گرد لہلہا رہی ہیں۔ جن نونہالوں نے اس کے آغوش میں نشوونما پائی وہ اب پھول پھل رہے ہیں ـــ یہ نونہال بھی اس کی مانند زندہ رہیں گے تاکہ کسی نہ کسی ویرانہ کو گلزار بنا جائیں۔

اور الہ آباد کے ایک ہندو پنڈت نے کہا:-

ہم مسلمانوں سے دولت میں زیادہ ہیں، تعلیم میں زیادہ ہیں، تعداد میں زیادہ ہیں۔ مگر افسوس ہے کہ ہم میں کوئی سید احمد خان نہیں۔ بلکہ ہم اگر بیس بھی مل کر ایک ہو جائیں تو بھی سرسید احمد خان کے برابر نہیں ہو سکتے

یہ تھا سرسید جو ساری عمر قوم کے غم میں گھلتا رہا، مسلسل محنت کرتا رہا لیکن کبھی شہرت کا خواہاں نہ ہوا ـــ جو لوگ کالج فنڈ میں عطیات دیتے تھے وہ ان کے نام کتبوں پر کندہ کرا کر مناسب مقامات پر نصب کرا دیتا تھا۔ جو لوگ اپنے خرچ سے کمرے اور ہال بنوا دیتے تھے۔ وہ ان عمارات کو ان کے نام کے ساتھ منسوب کر دیتا تھا۔ لیکن اس نے نہ تو اپنے نام کا کہیں کوئی کتبہ نصب کرایا نہ کسی عمارت کو اپنے نام سے منسوب کیا۔ یہ بھی تجویز کیا گیا کہ کالج کا نام اس کے نام پر رکھا جائے، اس نے اسے بھی مسترد کر دیا۔ اس کی عمر کے آخری حصہ میں بعض دوستوں نے چاہا کہ (FOUNDER'S DAY) منائیں۔ سرسید کو معلوم ہوا تو اس نے کہا کہ جس کالج کو قوم کے ایک ایک پیسے سے تعمیر کیا گیا ہو اس کے بانی کو (فونڈر) کہلانے کا حق کیسے حاصل ہو سکتا ہے؟ اگر تم نے

یومِ تاسیس مناؤ

منانا ہے تو (FOUNDER'S DAY) نہیں بلکہ (FOUNDATION DAY) مناؤ چنانچہ اس

تجویز کے مطابق مدرسہ کے یومِ تاسیس یعنی ۲۴ مئی ۱۸۷۵ء کی تقریب منائی جاتی رہی اور یہی وہ تقریب ہے عزیزانِ من! جسے منانے کے لئے ہم آج یہاں جمع ہوئے ہیں۔ یہ دن مدرسۃ علی گڑھ ہی کا یومِ تاسیس نہیں بلکہ درحقیقت پاکستان کا یومِ تاسیس ہے۔

جب سرسید کی مخالفت انتہائی شدت پر تھی اور اس کے رفیق، اس کی مدافعت کی کوشش کرتے تھے، تو اس نے ان میں سے ایک کو لکھا :-

مجھے کہاں تک بچاؤ گے۔ میں تو ہدفِ تیرِ ہائے ملامت ہو گیا ہوں اور روز بروز ہوتا جاؤں گا۔ شاید میرے بعد کوئی زمانہ آئے جب لوگ میری دلسوزی کی قدر کریں۔

دنیا میں بڑے لوگوں کے ساتھ بالعموم یہی ہوا کرتا ہے۔ یہ لوگ درحقیقت اپنے زمانے سے بہت آگے ہوتے ہیں اس لئے ان کا زمانہ ان کی صحیح قدر و قیمت نہیں پہچان سکتا۔ بعد میں آنے والے اس کا صحیح اندازہ کر سکتے ہیں۔ یہی سرسیدؒ کے ساتھ ہوا لیکن سرسید کی سب سے بڑی یادگار مملکتِ پاکستان ہے۔ جب تک یہ مملکت زندہ و پائندہ ہے ــــ خدا اسے ابدالآباد تک زندہ و پائندہ رکھے ــــ اُس وقت تک سرسید کا نام زندہ و پائندہ رہے گا اور اس کی دل سوزی کی قدر ہوتی رہے گی۔ وکذٰلک نجزی المحسنین۔ خدا کا ارشاد ہے۔ یہی تو وہ شمعیں ہیں جن سے انسانیت کی راہیں ہمیشہ جگمگاتی رہتی ہیں۔

تتمہ (مرحلۂ دوم)

سرسیدؒ کی تحریک کا دورِ اوّل تشکیلِ پاکستان کے ساتھ ختم ہو گیا۔ اُس کا مقصد مسلمانانِ ہند کو اس قابل بنانا تھا کہ وہ مصاف زندگی میں اپنی ہم عصر قوم، ہندو کے دوش بدوش چل سکیں۔ تقسیمِ ہند سے یہ دونوں قومیں ایک سطح پر آ گئیں ــــ اپنی اپنی آزاد مملکت میں اپنے معاملات آپ حل کرنے کے لئے صاحبِ اختیار ــــ اس کے بعد اِس اسکیم کا اگلا مرحلہ شروع ہوناتھا یعنی مملکتِ پاکستان کو اسلامی مملکت بنانے کا مرحلہ۔ جس طرح سرسیدؒ کے نزدیک آزاد زندگی بسر کرنے کا ذریعہ تعلیم تھا، اس طرح اس مملکت کو اسلامی بنانے کا ذریعہ بھی تعلیم کا نظام ہو تھا۔ اقبالؒ نے پاکستان کا تصور تو بعد میں دیا تھا، مسلمانوں کے لئے ایک جدید نظامِ تعلیم کا سوال بہت پہلے سے اُن کے پیشِ نظر تھا۔ وہ جب (حصولِ تعلیم کے بعد) یورپ سے واپس آئے ہیں تو انہوں نے محسوس کیا کہ "علی گڑھ اور دیوبند" کی ثنویت کا ختم کیا جانا اشد ضروری ہے اور یہ اسی طرح ممکن ہے کہ ان کا نظامِ تعلیم اس طرح بدلا جائے جس میں "دین اور دنیا" کا امتزاج بطریقِ احسن موجود ہو۔ انہوں نے سنہ ۱۹۱۰ء میں علی گڑھ یونیورسٹی میں ایک نہایت اہم لیکچر (انگریزی زبان میں) دیا تھا جس کا اردو ترجمہ "ملت بیضا پر ایک عمرانی نظر" کے عنوان سے اُنہی زمانے میں شائع ہوا تھا۔ اُس نے اس زمانہ میں بھی بڑی شہرت حاصل کی تھی اور وہ شہرت اب تک قائم ہے۔ اس میں انہوں نے منجملہ دیگر امورِ ملت کے لئے تعلیم کے نظام نو پر خاص طور پر زور دیا تھا۔ اس

سلسلہ میں انہوں نے کہا تھا :-

ہندوستان میں اسلامی یونیورسٹی کا قائم ہونا ایک اور لحاظ سے بھی نہایت ضروری ہے۔ کون نہیں جانتا کہ ہماری قوم کے عوام کی اخلاقی تربیت کا کام ایسے علماء اور واعظ سرانجام دے رہے ہیں جو اس خدمت کی سرانجام دہی کے پوری طرح اہل نہیں ہیں۔ اس لئے کہ اُن کا مبلغ علم اسلامی تاریخ اور اسلامی علوم کے متعلق نہایت ہی محدود ہے۔ اخلاق اور مذہب کے اصول و فروع کی تلقین کے لئے موجودہ زمانہ کے واعظ کو تاریخ، اقتصادیات اور عمرانیات کے حقائق عظیمہ سے آشنا ہونے کے علاوہ اپنی قوم کے لٹریچر اور تخیل میں پوری دسترس رکھنا چاہیئے۔ الندوہ علی گڑھ، مدرسہ دیوبند، اور اسی قسم کے دوسرے مدارس جو الگ الگ کام کر رہے ہیں، اس بڑی ضرورت کو پورا نہیں کر سکتے۔ ان تمام بکھری ہوئی تعلیمی قوتوں کا شیرازہ بند ایک وسیع تر اغراض کا مرکزی دارالعلوم ہونا چاہیئے جہاں افرادِ قوم نہ صرف خاص قابلیتوں کو نشوونما دینے کا موقع حاصل کر سکیں ۔ ۔ ۔ بلکہ تہذیب کا وہ اسلوب یا سانچہ تیار کیا جا سکے جس میں زمانۂ موجودہ کے ہندوستانی مسلمانوں کو ڈھالنا چاہیئے۔ پس یہ امر قطعی طور پر نہایت ضروری ہے کہ ایک نیا مثالی دارالعلوم قائم کیا جائے جس کی مسند نشین اسلامی تہذیب ہو، اور جس میں قدیم و جدید کی آمیزش عجب دلکش انداز سے ہوئی ہو ۔ اس قسم کی تصویر مثالی کھینچنا آسان کام نہیں۔ اس کے لئے اعلیٰ تخیل، زمانہ کے رجحانات کا لطیف احساس اور مسلمانوں کی تاریخ و مذہب کے مفہوم کی صحیح تعبیر لازمی ہے۔

اقبالؒ کے تصور کے اس مثالی دارالعلوم (یونیورسٹی) کے قیام کی طرف قوم نے کوئی توجہ نہیں دی۔ ۱۹۲۶ء میں مسلم یونیورسٹی میں علوم اسلامیہ کا ایک الگ شعبہ قائم کرنے کی اسکیم سامنے لائی گئی۔ اس کے لئے جو نصاب تجویز کیا گیا، صاحبزادہ آفتاب احمد خان (مرحوم) نے اس کے مسودہ کی ایک نقل علامہ اقبالؒ کے پاس بغرضِ تبصرہ ارسال کی۔ علامہؒ نے اس پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا :-

ہمارا پہلا مقصد جس کی بابت ہم دونوں متفق ہیں موزوں صفات کے علماء پیدا کرنا ہے جو ملت کی روحانی ضرورتوں کو پورا کر سکیں۔ مگر زندگی کے متعلق ملت کے زاویۂ نگاہ کے دوش بدوش ملت کی "روحانی" ضرورتیں بھی بدلتی رہتی ہیں۔ فرد کی حیثیت سے اس کی دماغی بغاوت، آزادی اور طبعی علوم کی غیر متناہی ترقی، ان چیزوں میں جو تبدیلی واقع ہوئی ہے اس نے جدید زندگی کی اساس کو یکسر متغیر کر دیا ہے۔ چنانچہ جس قسم کا علمِ کلام اور علمِ دین ازمنۂ وسطیٰ کے مسلمانوں کی تسکین قلب کے لئے کافی ہوتا تھا، وہ آج تسکین بخش نہیں ہے۔ اگر مذہب کی روح کو صدمہ پہنچانا مقصود نہیں بلکہ اجتہادی گہرائیوں کو دوبارہ حاصل کرنا مقصود ہے، تو فکرِ دینی کو از سرِ نو تعمیر کرنا قطعاً ضروری ہے۔ مجھے اندیشہ ہے کہ میں آپ کے مسلم دینیات کے مجوزہ نصاب سے اتفاق نہیں کر سکتا۔ میرے نزدیک قدیم طرز پر مسلم دینیات کا شعبہ قائم کرنا بالکل بے سود ہے۔ جہاں تک "روحانیت" کا تعلق ہے کہا جا سکتا ہے کہ قدیم تر دینیات فرسودہ خیالات کی حامل ہے اور جہاں تک تعلیمی حیثیت کا تعلق ہے جدید

مسائل کے طلوع، اور قدیم مسائل کی طرح نو کے مقابلے میں؟ اس کی کوئی قدر و قیمت نہیں۔ آج ضرورت ہے کہ دماغی اور ذہنی کاوش کو ایک نئی وادی کی طرف مہمیز کیا جائے اور ایک نئی دینیات و کلام کی تعمیر و تشکیل میں اسے بروئے کار لایا جائے

(مشاہیر کے تعلیمی نظریے بحوالہ ماہنامہ فکر و نظر، اپریل سنہ ۱۹۸۰ء صفحہ ۲۴)

انہوں نے جب سنہ ۱۹۳۰ء میں مسلمانوں کے لئے ایک جداگانہ مملکت کا تصور پیش کیا تو اس کا مقصد یہ بتایا کہ

اس سے اسلام کو ان اثرات سے جو عربی شہنشاہیت نے اس پر ثبت کر رکھے ہیں، آزاد ہونے اور اس طرح اپنے قانون، اپنی تعلیم اور اپنی ثقافت کو حرکت میں لانے اور انہیں ان کی اصلی روح اور زمانۂ حال کی روح کے قریب لانے کا موقع ملے گا۔

اُس زمانے کی انٹر کالجیٹ مسلم برادر ہُڈ نے (زبان پہ بار خدایا! یہ کون سے شاہین بچوں کا نام آیا!) جنوری سنہ ۱۹۳۸ء میں یومِ اقبال منانے کا فیصلہ کیا تو ملک کے مشاہیر کی طرف سے بہت سے پیغامات موصول ہوئے۔ ان میں ایک پیغام سر سکندر حیات خان (مرحوم) کی طرف سے بھی تھا، جو اُس زمانے میں پنجاب کے وزیر اعلیٰ تھے۔ اس پیغام کے جواب میں حضرت علامہؒ نے ۱۰ دسمبر سنہ ۱۹۳۷ء کو ایک بیان شائع فرمایا جو لفظی طور پر تو بڑا مختصر تھا لیکن معنوی اعتبار سے بڑا جامع۔ اس میں انہوں نے کہا:-

"سر سکندر حیات نے انٹر کالجیٹ مسلم برادر ہُڈ کے نام اپنے پیغام میں میرے متعلق جن کلمات تحسین کا اظہار کیا ہے، اس کے لئے میں اُن کا نہایت شکر گزار ہوں۔ لیکن انہوں نے اس میں جو تجویز پیش کی ہے۔ کہ میرے کلام کے قارئین اور دیگر حضرات جو میری فکر سے دلچسپی رکھتے ہیں، مجھے ایک تھیلی پیش کریں۔ تو اس سلسلہ میں میں چند الفاظ کہنا ضروری سمجھتا ہوں۔ میرا احساس یہ ہے کہ ایک پرائیویٹ فرد کی ضروریات کے مقابلہ میں خواہ اُس فرد کا کلام و پیغام قوم کے لئے کیسا ہی سرچشمۂ وجدان کیوں نہ ثابت ہوا ہو۔ قوم کی ضروریات بہر نوع فائق ہوتی ہیں ـــــ فرد اور اس کی ضروریات گزر جاتی ہیں، قوم اور اس کی ضروریات باقی رہتی ہیں۔

اسلامیہ کالج (لاہور) میں ایک ایسی (CHAIR) کی تنصیب جس میں عصر حاضر کے خطوط پر اسلامک ریسرچ کی جائے قوم کی اشد ضرورت ہے۔ ہندوستان کے اور کسی حصے میں بھی، مسلمانوں کی تاریخ، دینیات، فقہ اور تصوف سے ناواقفیت سے اس قدر ناجائز فائدہ نہیں اٹھایا گیا جتنا پنجاب میں۔ وقت پکار پکار کر کہہ رہا ہے کہ نہایت عمیق اور محتاط ریسرچ کی رُو سے، دنیا کو بتایا جائے کہ حقیقی اسلام کیا تھا وہ زندگی کس قسم کی تھی جو اس کی مدد سے ظہور میں آئی تھی، لیکن ان بلند مقاصد کو کس طرح ایک ایسے دباؤ نے کچل کر رکھ دیا جو ہندوستانی مسلمانوں کے قلب و ضمیر پر مسلط ہے۔ اس اثر اور دباؤ کا جلد از جلد الگ کیا جانا نہایت ضروری ہے تاکہ ہماری نوجوان نسل اس قابل ہو سکے کہ وہ آزادانہ اور فطری طور پر اپنے ضمیر کی نمود کر سکے۔ مجھے اُمید ہے کہ میری اس تجویز کو وزیر اعلیٰ کی تصویب حاصل ہو گی۔ اور ان کا اثر و رسوخ اسے کامیاب بھی بنا دے گا۔ میں اس فنڈ کے لئے ایک سو روپیہ کا حقیر سا عطیہ پیش کرتا ہوں۔

(تقاریر اقبالؒ ـ ـ صفحہ ۲۰۰)

اس کے چار ہی ماہ بعد، (اقبالؒ ہم سے رخصت ہو گیا) اور اس کے بعد (بہ تغیرِ مفہوم)

نہ اٹھا پھر کوئی "رومی" عجم کے لالہ زاروں سے

اقبالؒ تو ہم میں نہیں تھا لیکن اُس کے عطا کردہ تصوّرات تو ہم میں زندہ و پائندہ موجود تھے۔ لیکن جس طرح قوم نے اُن مقاصد کو بھی پشت ڈال دیا جن کے حصول کے لئے اقبالؒ نے پاکستان کا تصوّر دیا تھا، اسی طرح اس نے اس کے پیش کردہ نظامِ تعلیم کو بھی درخورِ اعتنا نہ سمجھا۔ نتیجہ اس کا ہماری زبوں حالی سے ظاہر ہے۔

اس سلسلہ میں، مَیں بصد معذرت اپنا ذکر درمیان میں لانے کے لئے مجبور ہوں۔ مجھے نہ سرسیدؒ سے کوئی نسبت ہے نہ اقبالؒ سے، لیکن چونکہ مجھے بھی اسی سرچشمۂ ہدایت سے کسبِ ضیا کرنے کی سعادت حاصل ہے جو اُن کی فکر کا سرچشمہ تھا۔ (یعنی قرآنِ حکیم)۔ اس لئے جب میں نے دیکھا کہ قوم اس بنیادی مسئلہ (یعنی جدید نظامِ تعلیم) کی طرف کوئی توجہ ہی نہیں دے رہی، تو میں نے سوچا، کہ چھوٹے سے پیمانے پہ ہی سہی، اقبالؒ کے تصور کے مثالی دارالعلوم کی طرح تو ڈال دی جائے۔ قرآنک ریسرچ سنٹر اور قرآنی درس گاہ کی میری اسکیم (جس کا تعارف طلوعِ اسلام کے صفحات میں متعدد بار ہو چکا ہے) اس کا نقطۂ آغاز ہے۔ جس طرح سرسیدؒ کی اسکیم کی شدید مخالفت ہوئی تھی، میرے اس منصوبہ کے راستے میں بھی بکثرت موانعات حائل کئے جا رہے ہیں، لیکن مجھے اُمید ہے کہ جس طرح سرسیدؒ آخرالامر اپنے ارادوں میں کامیاب ہو گئے تھے، میری یہ اسکیم بھی (بعونہٖ تعالےٰ) کامیابی سے ہمکنار ہو جائے گی۔ اگر ایسا ہو گیا تو یہ سرسیدؒ اور اقبالؒ کے حسین خوابوں کی تعبیر ہو گی اور قوم کے نوجوانوں کے سامنے وہ راستہ آجائے گا جو انہیں اس منزل تک پہنچا دے جس کی خاطر پاکستان حاصل کیا گیا تھا اور جو قرآن کا مقصود و مطلوب ہے۔ یہ انقلاب ہو تو بڑا انقلاب ہو۔ والسلام

معراجِ انسانیت

سیرتِ صاحبِ قرآن (علیہ التحیۃ والسلام) خود قرآن کے آئینے میں مفکرِ قرآن کا بلند پایہ شاہکار، عقل و عشق، فکر و نظر، دل اور دماغ کا حسین امتزاج۔ اس سیرتِ طیبہ کے مطالعہ سے

مقامِ محمدی — اور — انقلابِ محمدی نکھر کر سامنے آجاتے ہیں

حسنِ معنوی کے ساتھ صوری پاکیزگی بھی دیدہ زیب، بڑی تقطیع، اعلیٰ درجہ کا سفید کاغذ۔ ضخامت پانصد صفحات۔ کتابت طباعت نورانی۔ جلد مضبوط اور دلکش

قیمت -/۲۵ روپے (علاوہ محصول ڈاک)

ملنے کا پتہ

مکتبۂ دین و دانش چوک اُردو بازار لاہور ★ ادارہ طلوعِ اسلام ۲۵/بی گلبرگ ۲ لاہور

فہرست معطیان قرآنک ایجوکیشن سوسائٹی (۱۷ اپریل تا ۱۵ مئی سنہ ۱۹۸۰ء)

اسمائے گرامی	رقم	رسید نمبر	اسمائے گرامی	رقم	رسید نمبر
محترم			محترم		
۱- احباب کویت معرفت محمد مرجان زماں صاحب بشمولیت ۵ دینار	روپے ۱۰،۰۰۰/-	۳۱۲۰ اور	۲۶- مقرب خان صاحب معرفت بزم طلوع اسلام۔ راولپنڈی	۵۰۰/- [illegible]	۳۱۵۲
منجانب ماسٹر سراج دین صاحب)		۳۱۹۹	۲۷- چوہدری حمید صاحب " " " "	۲۰۰/-	۳۱۵۳
۲- عبدالحمید صاحب۔ راولپنڈی کینٹ	۳۰۰/-	۳۱۲۱	۲۸- چوہدری برکت علی صاحب " " "	۱۰۰/-	۳۱۵۴
۳- بزم طلوع اسلام۔ لاہور چھاؤنی	۵۰۰/-	۳۱۲۲	۲۹- عبدالمتین صاحب " " "	۱۰۰/-	۳۱۵۵
۴- منسلے۔ خان صاحبہ معرفت مس آر خان صاحبہ۔ بحرین	۲۵۸/-	۳۱۲۳	۳۰- سید امین صاحب " " "	۵۰/-	۳۱۵۶
۵- معرفت منشی غلام محمد صاحب۔ کرک	۱۳۰/-	۳۱۲۴ تا ۳۱۲۹	۳۱- ریاض احمد قریشی صاحب " " "	۵/-	۳۱۵۷
۶- نام کی اشاعت نہیں چاہتے۔	۱۰۰/-	۳۱۳۰	۳۲- محمد شریف صاحب معرفت بزم طلوع اسلام۔ کراچی	۱۰۰/-	۳۱۵۸
۷- ملک رشاد امین خالد صاحب معرفت بزم طلوع اسلام۔ لاہور	۵۰/-	۳۱۳۱	۳۳- نام کی اشاعت نہیں چاہتے " " "	۱۰۰/-	۳۱۵۹
۸- محمد عاصم صاحب۔ لاہور	۲۰۰/-	۳۱۳۲	۳۴- حاجی احمد صاحب " " "	۱۰۰/-	۳۱۶۰
۹- ایم۔ آر عباسی صاحب۔ لندن معرفت بزم طلوع اسلام۔ لندن	۶۵۶/۸۰	۳۱۳۴	۳۵- نذیر احمد اینڈ سنز " " "	۲۰۰/-	۳۱۶۱
۱۰- حبیب محمد جان صاحب۔ لندن " " "	۲،۱۸۷/-	۳۱۳۶	۳۶- عبدالغفار صابر صاحب " "	۱۸۰/-	۳۱۶۲
۱۱- خالد محمود صاحب۔ (ڈیم) " " "	۲،۱۸۷/-	۳۱۳۷	۳۷- یونس قریشی صاحب " " "	۱۸۰/-	۳۱۶۳
۱۲- ضیاء الدین صاحب معرفت بزم طلوع اسلام۔ مردان	۲۰۰/-	۳۱۳۸	۳۸- محمد قریش صاحب " " "	۱،۰۰۰/-	۳۱۶۴
۱۳- محمد اسلم خان صاحب " " "	۱۰/-	۳۱۳۹	۳۹- محمد اسحاق سرو صاحب معرفت بزم طلوع اسلام۔ برمنگھم	۴۳۸/۴۰	۳۱۶۵
۱۴- ابو زاہد محمد سلمان صاحب۔ ہری پور ہزارہ	۱۰،۰۰۰/-	۳۱۴۰	۴۰- محمد یعقوب صاحب " " "	۲۲۴/۴۰	۳۱۶۶
۱۵- محمد ارشاد صاحب۔ چاہ دہان۔ مری	۲۵/-	۳۱۴۱	۴۱- چوہدری خوشی محمد صاحب " " "	۱۱۲/۱۰	۳۱۶۷
۱۶- مرزا احمد بیگ صاحب۔ گجرات معرفت بزم طلوع اسلام۔ گجرات	۵۰۰/-	۳۱۴۲	۴۲- چوہدری فضل حسین صاحب " " "	۱۱۲/۱۰	۳۱۶۸
۱۷- گجرات کمیشن شاپ " " "	۵۰۰/-	۳۱۴۳	۴۳- راجہ محمد افسر صاحب معرفت بزم طلوع اسلام۔ راولپنڈی	۱۰،۰۰۰/-	۳۱۶۹
۱۸- چوہدری نذیر احمد صاحب۔ کتھال " " "	۱۰۰/-	۳۱۴۴	۴۴- سردار محمد گلشن صاحب۔ رحیم یار خان	۳۰۰/-	۳۱[illegible]
۱۹- سید امداد حسین شاہ صاحب۔ سید کسری " "	۱۰۰/-	۳۱۴۵	۴۵- خان صدیق خان صاحب معرفت بزم طلوع اسلام۔ ملتان	۱۰۰/-	۳۱۷۱
۲۰- سید علی اکرم شاہ صاحب۔ سید کسری " "	۱۰۰/-	۳۱۴۶	۴۶- محمد اسحاق صاحب۔ فیصل آباد	۵۰/-	۳۱۷۲
۲۱- صوفی عبدالعزیز صاحب۔ ٹبہ لوٹے شاہ " "	۵۰/-	۳۱۴۷	۴۷- نام اور پتہ ظاہر نہیں کیا۔	۵۰/-	۳۱۷۳
۲۲- سید عباس علی شاہ صاحب۔ ٹبہ لوٹے شاہ " "	۵۰/-	۳۱۴۸	۴۸- مسز ظفر سعید صاحبہ۔ سیالکوٹ	۳۰۰/-	۳۱۷۴
۲۳- صوفی فضل احمد صاحب۔ ٹبہ لوٹے شاہ " "	۵۰/-	۳۱۴۹	۴۹- اعجاز احمد صاحب۔ الصفاۃ۔ کویت	۱۰،۰۰۰/-	۳۱۷۵
۲۴- شیخ قدرت اللہ صاحب۔ ایڈووکیٹ " "	۱،۰۰۰/-	۳۱۵۰	۵۰- عبدالرحمٰن صاحب۔ واہ کینٹ	۱۰۰/-	۳۱۷۶
۲۵- ملک حنیف وجدانی صاحب۔ مری	۱۰۰/-	۳۱۵۱	۵۱- پرویز مرزا صاحب معرفت بزم طلوع اسلام۔ کراچی	۱،۰۰۰/-	۳۱۷۷

اسمائے گرامی	رقم	رسید نمبر
۵۲۔ محمد عباس صاحب معرفت بزمِ طلوعِ اسلام۔ کراچی	۱۰۰/- پونڈ	۳۱۷۸
۵۳۔ محمد رمضان صاحب 〃 〃 〃	۵۰/-	۳۱۷۹
۵۴۔ محمد محسن صاحب 〃 〃 〃	۵۰/-	۳۱۸۰
۵۵۔ چوہدری نصراللہ خاں صاحب۔ چک ۱۰ شمالی۔ سرگودھا	۲,۵۰۰/-	۳۱۸۱
۵۶۔ سید امین قریشی صاحب، اسلام آباد	۵۰/-	۳۱۸۲
۵۷۔ ملک عثمان صاحب معرفت بزمِ طلوعِ اسلام۔ ملتان	۵۰/-	۳۱۸۳
۵۸۔ منظور حسین صاحب اوسلو معرفت منظور احمد صاحب۔ اوسلو ناروے	۲,۰۰۰/-	۳۱۸۴
۵۹۔ چوہدری گلزار احمد صاحب اوسلو 〃 〃 〃	۲,۰۰۰/-	۳۱۸۵
۶۰۔ عبدالرحیم خاں صاحب 〃 〃 〃	۲,۰۰۰/-	۳۱۸۶
۶۱۔ محمد عباس بلوچ صاحب 〃 〃 〃	۱,۰۰۰/-	۳۱۸۷
۶۲۔ سردار احمد صاحب 〃 〃 〃	۴۰۰/-	۳۱۸۸
۶۳۔ محمد ارشد صاحب 〃 〃 〃	۴۰۰/-	۳۱۸۹
۶۴۔ محمد شہزاد گل صاحب 〃 〃 〃	۳۰۰/-	۳۱۹۰
۶۵۔ امجد محسود صاحب 〃 〃 〃	۴۰۰/-	۳۱۹۱
۶۶۔ تازلی صاحب (ترکیہ) 〃 〃 〃	۲۰۰/-	۳۱۹۲
۶۷۔ عبدالغفور بٹ صاحب 〃 〃 〃	۳۰۰/-	۳۱۹۳
۶۸۔ محمد صفدر صاحب 〃 〃 〃	۲۰۰/-	۳۱۹۴
۶۹۔ محمد اصغر صاحب 〃 〃 〃	۳۰۰/-	۳۱۹۵
۷۰۔ معراج دین صاحب 〃 〃 〃	۲۰۰/-	۳۱۹۶
۷۱۔ ہدو صاحب (مراکو) 〃 〃 〃	۱۰۰/-	۳۱۹۷
۷۲۔ منظور احمد صاحب۔ اوسلو۔ ناروے	۳,۰۰۰/-	۳۱۹۸
۷۳۔ یعقوب صاحب۔ لندن معرفت بزمِ طلوعِ اسلام۔ لندن	۵۳۶/۵۰	۳۲۰۰
۷۴۔ عجیب خاں صاحب 〃 〃 〃 〃	۱۰۷/۲۵	۳۲۰۱
۷۵۔ شوکت علی صاحب 〃 〃 〃	۱۰۷/۲۵	۳۲۰۲
۷۶۔ لندن ٹرمنگ کمپنی۔ ایسٹ لندن 〃 〃 〃	۲۳۶/-	۳۲۰۳
۷۷۔ تسنیم احمد صاحب۔ بیترے آنر ایسیکس 〃 〃	۱۰۷/۲۵	۳۲۰۴
۷۸۔ غلام جعفر عباسی صاحب۔ بیسلے مڈلسیکس 〃 〃	۱۰۷/۲۵	۳۲۰۵

اسمائے گرامی	رقم	رسید نمبر
۷۹۔ مقبول محمود فرحت صاحب۔ لندن معرفت بزمِ طلوعِ اسلام۔ لندن	۲۱۴/۵۰	۳۲۰۶
۸۰۔ علی اختر صاحب۔ لندن 〃 〃 〃 〃	۳۰۴/۸۰	۳۲۰۷
۸۱۔ مسز بشریٰ علی صاحبہ۔ لوٹن 〃 〃 〃	۱۵۰۲/۴۰	۳۲۰۸
۸۲۔ ڈاکٹر زبیر مرزا صاحب۔ لندن 〃 〃 〃	۴۲۸/۴۰	۳۲۰۹
۸۳۔ ہارون عسکری صاحب۔ لندن 〃 〃	۶۷۲/۵۰	۳۲۱۰
۸۴۔ ایچ۔ اے۔ محمد صاحب۔ ساؤتھ لندن 〃 〃 〃	۴۴۸/۴۰	۳۲۱۱
۸۵۔ صلاح الدین صاحب 〃 〃 〃 〃	۱۱۲/۰۵	۳۲۱۲
۸۶۔ مس راحت چوہدری صاحبہ۔ لندن 〃 〃 〃	۱۱۳/۰۵	۳۲۱۳
۸۷۔ نسیم احمد صاحب۔ لندن 〃 〃 〃	۱۱۲/۰۵	۳۲۱۴
۸۸۔ جاوید غنی صاحب۔ لندن 〃 〃 〃	۱۱۲/۰۵	۳۲۱۵
۸۹۔ ایم۔ ایم عیسائق صاحب۔ لندن 〃 〃 〃	۱۱۲/۰۵	۳۲۱۶
۹۰۔ ایم۔ ایم ڈیسولق صاحب۔ لندن 〃 〃 〃	۱۱۲/۰۵	۳۲۱۷
۹۱۔ قاسم کریم صاحب۔ لندن 〃 〃 〃	۱۱۲/۰۵	۳۲۱۸
۹۲۔ ٹی زبیر لمیٹڈ۔ لندن 〃 〃 〃	۴۴۸/۴۰	۳۲۱۹
۹۳۔ مس ناہید قمر صاحبہ۔ بارکنگ ایسیکس 〃 〃 〃	۱۱۲/۰۵	۳۲۲۰
۹۴۔ والی علی صاحب۔ ساؤتھ لندن 〃 〃 〃	۲۲۴/۲۰	۳۲۲۱
۹۵۔ ولی محمد ٹی۔ ویانی صاحب۔ نیروبی بذریعہ سلیمان اے میمن صاحب۔ کراچی	۱۰,۰۰۰/-	۳۱۲۲

میزان = ۶۸,۸۸۵/۹۰ روپے

سابقہ میزان = ۳,۷۸,۰۳۲/۳۳ 〃

کل میزان = ۴,۴۶,۹۱۸/۲۳ روپے

ضروری تصحیح

فہرست معطیان قرآنک ایجوکیشن سوسائٹی۔ نمبر شمار ۲۷، صفحہ ۱۲ شمارہ فروری ۱۹۸۰ء کے سامنے بجائے "محترم محمد نیاز صاحب" "محترم نیاز محمد صاحب" پڑھا جائے۔

ریکارڈ میں رکھئے

اخبارات میں شائع شدہ خبروں کی عمر ایک دن کی ہوتی ہے لیکن ان میں بعض خبریں ایسی بھی ہوتی ہیں جن کی اہمیت دیر تک باقی رہتی ہے اور مناسب وقت پر ان کا حوالہ نہایت مفید نتائج پیدا کرتا ہے۔ ذیل میں ہم اخبارات میں شائع شدہ چند ایک اسی قسم کی خبریں درج کرتے ہیں۔ ان کے عنوانات اور متن متعلقہ اخبارات میں شائع شدہ ہیں اور ان پر ہم اپنی طرف سے کسی قسم کا تبصرہ نہیں کر رہے۔

(۱) دینی مدارس میں اسلام کے بجائے فرقہ واریت سکھائی جا رہی ہے۔

لاہور ۲۴ر اپریل (سٹاف رپورٹر) مجلس خدمتِ اسلامی کے زیر اہتمام دو روزہ نفاذِ شریعت کانفرنس کے افتتاحی اجلاس میں مقررین نے کہا کہ پاکستان کا قیام شریعت کے نفاذ کے لئے عمل میں آیا تھا اور اہلِ پاکستان کے مسائل اسلامی نظام کے ذریعے ہی حل ہو سکتے ہیں۔ اس مقصد کے لئے حکومت اور عوام سب کو اپنا اپنا کردار ادا کرنا چاہیئے، یہ کسی فردِ واحد کی ذمہ داری نہیں، البتہ حکمرانوں کی ذمہ داریاں سب سے زیادہ ہیں۔ اجلاس کی صدارت میاں طفیل محمد نے کی۔ میاں طفیل محمد نے اپنی صدارتی تقریر میں کہا کہ اب تک شریعت اور اسلام کے نظام کو نافذ نہ کرنے کی وجہ سے ملک میں ایک خلاء پیدا ہو گیا ہے۔ شریعت کے بغیر نہ ہم سچے مسلمان ہو سکتے ہیں اور نہ ہی وہ ملک مضبوط ہو سکتا ہے جو شریعت کی خاطر قائم کیا گیا تھا۔ انہوں نے کہا پاکستان ہی کے نہیں پوری انسانیت کے مسائل کا حل صرف نظامِ اسلام میں ہے۔

انہوں نے کہا کہ اس نظام کے نفاذ کے سلسلے میں ہم خود بھی رکاوٹ ہیں۔ ہمیں خود اپنا اپنا احتساب کرنا چاہیئے اور اگر ہم سب عزم کر لیں تو یہ نظام ملک میں نافذ ہو کر رہے گا۔

میاں طفیل محمد نے اس امر پر افسوس کا اظہار کیا کہ ہمارے دینی مدارس میں اسلام کی بجائے فرقہ واریت سکھائی جا رہی ہے اور کہا کہ ہمیں اپنے مدارس اور مساجد کا بھی احتساب کرنا چاہیئے کہ اور دیکھنا چاہیئے کہ وہ تو اسلام کے راستے میں رکاوٹ نہیں اگر ہم اس سلسلے میں مخلص ہیں تو ہمیں اپنے اعمال اور ماحول کا جائزہ لینا چاہیئے۔

(نوائے وقت مورخہ ۲۵ر اپریل ۱۹۸۰ء)

(۲) حضرت خواجہ معین الدین اجمیریؒ کے مزار کیلئے بیش قیمت چادر بھیجدی گئی

لاہور ۲۳ر اپریل (اپ پ) حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کے مزار کے لئے نقرئی نقش و نگار والی سیاہ چادر جو

دو لاکھ روپے میں تیار ہوئی آج لاہور سے اجمیر (بھارت) بھیج دی گئی ہے جو عرس کے موقع پہ چڑھائی جائے گی۔ عرس ۱۷ رمئی سے شروع ہوگا۔ اس چادر میں خالص چاندی کے تاروں سے نقش بنائے گئے ہیں اور اس میں عقیق لعل اور جواہرات بھی ٹانکے گئے ہیں چادر حضرت خواجہ معین الدین اجمیریؒ کے ایک عقیدتمند نے جس کا نام نہیں بتایا گیا تیار کی ہے۔ چادر کو حضرت بابا فریدالدین گنج شکرؒ کے سجادہ نشین دیوان بختیار لے کر گئے ہیں لارنس روڈ لاہور کے چشتی ہاؤس میں اس چادر کی نمائش بھی ہوئی جس میں قوالی بھی کرائی گئی۔ چادر کو واہگہ کے راستے بھیجا گیا واہگہ تک لے جانے کے لئے چالیس عقیدتمند ہمراہ گئے جن میں لاہور ہائی کورٹ کے جج مسٹر جسٹس غلام محمد مرزا بھی شامل تھے۔ (مشرق۔ مورخہ ۲۵ اپریل ۱۹۸۰ء)

(۳) ایم۔ اے اسلامیات کی اسلامی معلومات!

راولپنڈی کے (انگریزی) روزنامہ "دی مسلم" کی ۲۳ ر اپریل ۱۹۸۰ء کی اشاعت میں ذیل کی خبر شائع ہوئی ہے۔

"پنجاب یونیورسٹی کے سمسٹر سسٹم کے تحت ایک ایم۔ اے اسلامیات ڈگری (A-گریڈ) یافتہ نوجوان اسلامیات کی لیکچرشپ کی اسامی کے لئے پبلک سروس کمیشن کے سامنے بطور امیدوار پیش ہوا۔ اس سے پہلا سوال یہ پوچھا گیا ـــــ غزوۂ بدر کب واقعہ ہوا تھا؟ اس کے جواب میں یہ امیدوار خاموش رہا۔ اسے کچھ معلوم نہیں تھا۔

دوسرا سوال یہ تھا کہ اس غزوہ میں مسلمانوں کو شکست ہوئی تھی یا فتح؟ وہ حسب سابق خاموش رہا۔

اس پہ پبلک سروس کمیشن کے چیئرمین نے سوال پوچھنے والے ممبر سے طنزاً کہا کہ آپ اس (بیچارے) سے بہت مشکل سوال پوچھ رہے ہیں۔ اس سے آسان سوال پوچھنے چاہئیں تھے۔ اس کے بعد چیئرمین صاحب نے خود یہ سوال پوچھا کہ "حضرتِ فاطمہؓ کا نبی اکرمؐ کے ساتھ کیا رشتہ تھا؟" امیدوار نے جواب تو دیا لیکن وہ بڑا حیران کن تھا اور ایک مسلمان ایم۔ اے اسلامیات کے قطعاً شایانِ شان نہیں تھا۔"

(۴) کوڑوں کی سزا

لاہور ۲۷ ر اپریل (نامہ نگار) لاہور ہائی کورٹ کے مسٹر جسٹس غلام مجدد مرزا نے قصور ڈکیتی کیس کے ملزموں کی دائر کردہ اپیل پہ اپنا فیصلہ صادر کرتے ہوئے قرار دیا ہے کہ جب ملزموں کو قید کی معقول سزا دی جا چکی ہو تو انہیں کوڑوں کی سزا نہیں دی جانی چاہیئے۔ عدالت نے اپنے فیصلے میں کوڑوں کے بارے میں قانون کی تاریخ کا حوالہ دیتے ہوئے مولانا مودودی کی تفہیم القرآن کا بھی حوالہ دیا۔ تفہیم القرآن کی جلد سوئم کے صفحہ نمبر ۳۴۰ میں لکھا ہے کہ ضربِ تازیانہ کی کیفیت کے متعلق پہلا اشارہ خود قرآن کے لفظ فاجلدو جلدہ کا لفظ جلد (یعنی کھال) سے ماخوذ ہے اس سے تمام اہل لغت اور علمائے تفسیر نے یہی معنی لئے ہیں کہ مار ایسی ہونی چاہئے جس کا اثر جلد تک رہے گوشت تک نہ پہنچے ایسی ضرب تازیانہ جس سے گوشت کے ٹکڑے اڑ جائیں اندر تک زخم پڑ جائے قرآن کے خلاف ہے۔

(نوائے وقت ۲۸ ر اپریل ۱۹۸۰ء)

(۵) لندن میں اسلامی ہفتہ شروع ہو گیا

راولپنڈی کے انگریزی روزنامہ دی مسلم کی ۱۹ اپریل کی اشاعت میں ذیل کی خبر شائع ہوئی ہے:۔

"اسلامی ہفتہ، جس کا آغاز کل (۱۹ اپریل) سے ہو رہا ہے لندن میں منعقد ہو گا۔ اس میں تمام مسلم ممالک کے نامور مسلم سکالرز، مفکر، سیاستدان اور اسلامی تحریکوں اور اسلامی حریت کی تنظیموں کے نمائندگان شریک ہوں گے تاکہ اسلامک کونسل کے زیر اہتمام منعقد ہونے والی بین الاقوامی کانفرنسوں میں شمولیت اختیار کر سکیں"۔

اس کے بعد اسی اخبار کی ۲۰ اپریل کی اشاعت میں حسب ذیل خبر شائع ہوئی ہے۔

بین الاقوامی اسلامی کانفرنس کے پہلے اجلاس میں ذیل کے اعلامیہ کا اعلان کیا گیا:۔

ہر ایک مسلم ملک کے لئے لازمی ہو گا کہ وہ بالفاظ صریح اس امر کا اعلان کرے کہ ملک کے تمام باشندوں کے پرائیویٹ اور پبلک معاملات کے فیصلے شریعت کے مطابق ہوں گے اور اس میں رعایا اور حکمران طبقہ سب شامل ہوں گے۔ نیز یہ کہ ملک کے جملہ قوانین کا بنیادی سرچشمہ شریعت ہو گی۔ (اس اعلامیہ میں یہ بھی کہا گیا ہے کہ) تمام اختیارات شریعت کی حدود کے اندر رہتے ہوئے استعمال کئے جائیں گے۔ اور اگر یہ فیصلے ملت کے باہمی مشورہ سے نہیں ہوں گے تو انہیں نہ آئینی جواز حاصل ہو گا اور نہ ہی یہ قابل نفاذ تصور ہوں گے۔

---

(۶) خانہ کعبہ کا نیا دروازہ

ہفت روزہ المنبر، فیصل آباد کی ۲ تا ۸ نومبر ۱۹۷۹ء کی اشاعت میں پہلے ذیل کا شذرہ چھپ کے میں شائع ہوا ہے:۔

حرمین شریفین کے خدام کی روایت یہ چلی آتی ہے کہ حج کا موسم آتا ہے تو بیت اللہ کو غسل دیا جاتا ہے اور اس پر نیا غلاف چڑھایا جاتا ہے۔ اس سال بھی یہ تقریب ۲۲ ذی قعدہ کو منعقد ہوئی۔ شاہ خالد بن عبدالعزیز حسب سابق غسل کعبہ کی سعادت حاصل کرنے کے لئے آئے، لیکن اس مرتبہ غسل کعبہ سے پہلے ایک اور تاریخی تقریب کا اہتمام تھا۔ کعبہ میں ایک نیا دروازہ نصب کیا جا چکا تھا۔ اور شاہ خالد کو آج اس کا افتتاح کرنا تھا۔ ایک ہزار کلو گرام سے زیادہ وزن کا یہ طلائی دروازہ انہی کی ہدایت اور خواہش کے مطابق تیار کیا گیا تھا اور یہ اپنی ساخت اور زیبائش میں اسلامی حرفت اور خطاطی کا بہترین نمونہ ہے۔

اس کے بعد اس میں ذیل کی خبر شائع ہوئی ہے:۔

شاہ خالد بن عبدالعزیز دو سال قبل جمادی الاول ۱۳۹۶ھ بیت اللہ کے اندر نماز پڑھنے کے لئے داخل ہوئے تو اس وقت انہیں خیال آیا کہ باب کعبہ نیا بنایا جائے۔ اس وقت جو دروازہ وہاں موجود تھا، وہ کوئی بہت پرانا نہ تھا بلکہ صرف ۳۲ برس پہلے ۱۳۶۳ھ میں شاہ عبدالعزیز بن سعود کے عہد میں نصب کیا گیا تھا۔ البتہ وہ اتنا

قیمتی دروازہ نہ تھا۔ اس میں سامنے کی طرف ایلومونیم اور پیچھے کی طرف لوہے کے تختے تھے۔ پھر المونیم کے اوپر چاندی کے تختے لگائے گئے تھے۔ جن پر سونے کا پانی چڑھا ہوا تھا۔ اس کے برعکس شاہ خالد نے وزیر حج و اوقاف شیخ عبدالوہاب عبدالواسع کو ہدایت کی کہ نیا دروازہ تمام تر خالص سونے سے بنایا جائے اور پھر عقب میں باب التوبہ بھی اسی نمونے کا ہو۔ وزیر حج نے مکہ مکرمہ ہی کے ایک دستکار شیخ احمد ابراہیم بدر کو اس کام کا ٹھیکہ دیا۔ جس کی مالیت ایک کروڑ ۲۴ لاکھ ۳۰ ہزار ریال تھی۔ اس میں سونے کی مقدار شامل نہ تھی۔ جس کی فراہمی کا بندوبست حکومت نے کیا۔ دروازے کے دونوں کواڑوں میں ۲۸۰ کلوگرام سونا استعمال ہوا ہے اور یہ بالکل خالص سونا ہے۔

(۷) بے نمازیوں کے لئے سزا اور تعزیر کی ضرورت

ہفت روزہ الاعتصام (لاہور) کی اشاعت بابت ۲۹ جنوری ۱۹۸۸ء میں، عنوان بالا کے تحت ایک مضمون شائع ہوا ہے جس میں کہا گیا ہے :۔

پس بے نماز کے کافر ہونے پر تمام صحابہ کرامؓ کا اجماع ہے اس لئے صدر مملکت کا یہ فرض ہے کہ بے نمازوں پر سزا اور تعزیر مقرر کریں اور تمام ائمہ مساجد کے نام حکم نافذ کریں کہ وہ اپنے ماتحت نمازیوں کی حاضری لیا کریں۔ جو شخص حاضر نہ ہو اس سے دریافت کیا جائے کہ وہ کیوں غیر حاضر ہوا اگر وہ شرعی عذر پیش کرے تو اس سے درگذر کیا جائے اور جو عمداً کسی دنیاوی عذر سے حاضر نہ ہو تو اس کو سزا دی جائے اس قانون کے نافذ ہوتے ہی تمام مسجدیں یقیناً نمازیوں سے بھر جائیں گی اور ملک سے جرائم کم ہو جائیں گے کیونکہ قرآن پاک پارہ ۲۱ میں نماز کی یہ خاصیت بیان کی گئی ہے : إِنَّ الصَّلٰوةَ تَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَاءِ وَ الْمُنْكَرِ۔ یعنی " نماز نمازی کو بے حیائی اور برے کاموں سے روکتی ہے۔"

(۸) دعائے صحت کا مسنون طریقہ

۱۲ دسمبر ۱۹۸۷ء کے ہفت روزہ ایشیا میں سید ابوالاعلیٰ مودودی (مرحوم) کے ایک مکتوب گرامی کا عکس شائع ہوا ہے جو انہوں نے سابق امیر ضلع (آزاد) چوہدری نذیر احمد (مرحوم) کی بیگم صاحبہ کے خط کے جواب میں چوہدری صاحب کی عیادت کے سلسلہ میں لکھا تھا۔ اس میں انہوں نے مریض کے مناسب علاج اور دعائے صحت کی تلقین کے بعد تحریر فرمایا تھا :۔

> اس کے علاوہ رات کو سوتے وقت قل ھو اللہ، قل اعوذ برب الفلق، اور قل اعوذ برب الناس تین دفعہ پڑھ کر اپنے ہاتھوں پر پھونکیں۔ اور پھر ان کو چوہدری صاحب کے سارے جسم پر ملیں۔ بلکہ اگر چوہدری صاحب ہوش میں ہوں تو ان کے ہاتھوں پر پھونکیں اور وہ خود اپنے ہاتھ اپنے سارے جسم پر ملیں۔ یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اپنا طریقہ تھا اور آپ کی آخری بیماری میں حضرت عائشہؓ کبھی اپنے ہاتھوں پر پھونکتی اور حضورؐ کے جسم مبارک پر انہیں ملتی تھیں، یا حضورؐ کے دونوں ہاتھوں پر پھونک کر

آپ کے ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر جسمِ اطہر پر نہیں پھیرتی تھیں۔

(۹) سعودی نظامِ مملکت

ہفت روزہ "الاعتصام" کی ۴ر اپریل ۱۹۸۰ء کی اشاعت میں ایک خبر شائع ہوئی ہے جس میں کہا گیا ہے کہ جلالۃ الملک شاہ خالد (حفظہ اللہ) کے حکم پر ایک خصوصی کمیٹی مقرر کی گئی ہے کہ وہ سعودی نظامِ مملکت کے متعلق اپنی سفارشات پیش کرے۔ خبر کی اشاعت کے بعد الاعتصام نے لکھا ہے:-

"سعودی مملکت میں جو نظامِ حکومت نافذ ہے اسے عرفِ عام میں بادشاہت کہا جاتا ہے۔ گزشتہ چند صدیوں سے (انقلابِ فرانس کے بعد) جمہوریت کا جو غلغلہ بلند ہے اور جمہوری نظام کے بارے میں شاطرانِ مغرب نے جو افسوں پھونکا ہے اس سے اکثر لوگ شاہدِ جمہوریت کی عشوہ طرازیوں سے مسحور و مرعوب اور اس کی زلفِ گرہ گیر کے اسیر ہو گئے اور شخصی نظامِ حکومت کو بُرا سمجھنا تعلیم یافتہ ہونے کی علامت سی بن گیا۔ ایک ایسے ہی فکرِ مغرب کے پروردہ نے ۱۹۲۴ء میں عثمانی خلافت کو تاراج کیا اور مغرب کا سیکولر نظامِ حکومت نافذ کیا۔ اور یوں وہ ترکی، جو صدیوں سے نہ صرف اسلام کا علمبردار بلکہ اسلام اور عالمِ اسلام کا محافظ بھی تھا، بطورِ حکومت وہ اسلام کی نعمتِ لازوال سے محروم کر دیا گیا حتیٰ کہ عربی زبان میں اذان تک دینی ممنوع کر دی گئی۔

بہرحال مقصد اس گفتگو کا یہ ہے کہ آج کل شخصی نظام کو بہت بُرا سمجھا جاتا ہے گو یہ سمجھنا بالکل بے بنیاد نہیں۔ تاہم خلطِ مبحث یہ کر دیا جاتا ہے کہ افراد کی خرابی نظام کے سر مڑھ دی جاتی ہے۔ جو بالکل غلط ہے۔ حالانکہ صحیح بات یہ ہے کہ بحیثیت مجموعی شخصی نظامِ حکومت پارلیمانی نظام سے زیادہ بہتر اور پائیدار ہے لیکن بعض دفعہ غلط آدمی اس شخصی نظام کے نام پر مطلق العنانیت کا رُوپ دھار لیتا ہے اور ظلم و ستم کو اپنا پیدائشی حق سمجھ لیتا ہے۔ اگرچہ ہوتا جمہوریت میں بھی یہی ہے کہ غلط آدمی اس میں بھی مطلق العنان ہو کر ظلم و ستم کو اپنا پیشہ بنا لیتا ہے۔ لیکن جمہوریت میں اسے بالعموم نظر انداز کر دیا جاتا ہے لیکن شخصی حکومت کو مطلق العنانیت کا ہم معنی بنا دیا گیا ہے۔

الغرض ہمارے خیال میں حکمران صحیح ہو، خوفِ خدا اور ملک و ملّت کی اصلاح و خیرخواہی کا جذبہ رکھنے والا ہو تو وہ شخصی نظام میں زیادہ بہتر طریقے سے ملک و قوم اور دین و مذہب کی خدمت کر سکتا ہے۔ سعودی مملکت بھی ایک ایسی حکومت ہے جس میں شخصی نظامِ حکومت نافذ ہے، اور ہماری دعا ہے کہ وہاں جمہوریت کی بجائے یہی شخصی نظام نافذ رہے۔ البتہ اس میں بعض دفعہ مطلق العنانیت کے جو اثرات آ جاتے ہیں، اس سے اللہ تعالیٰ اس کو بچا کر رکھے اور دینِ اسلام کی صراطِ مستقیم پر گامزن رکھے۔"

خریداران متوجہ ہوں

قارئینِ طلوعِ اسلام سے گزارش ہے کہ ترسیلِ چندہ اور خط و کتابت کے سلسلے میں مکمل پتہ اور اپنے خریداری نمبر کا حوالہ ضروری ہے۔ اس سے اُن کے ارشاد کی تعمیل میں تاخیر نہیں ہوگی۔ (ناظم ادارہ)

انشاء اللہ

(سر سید احمد خانؒ)

(سر سیدؒ نے ہمارے مروجہ اسلام کے غلط معتقدات اور رسومات کی اصلاح کے لئے کیا کچھ کیا، اس کی تفصیل کے لئے ایک ضخیم کتاب کی ضرورت ہے۔ ذیل میں ہم ان کا ایک مختصر سا مقالہ درج کرتے ہیں جس سے اندازہ ہو سکے گا کہ وہ اس محاذ پر کن کن گوشوں سے اور کس کس انداز سے حملہ کرتے تھے۔

ہماری کتبِ فقہ میں ایک باب "کتاب الحیل" کا ہوتا ہے۔ اصل کتاب میں یہ بتایا جاتا ہے کہ شریعت کی رو سے کون کون سی باتیں گناہ ہیں۔ اور "کتاب الحیل" میں یہ بتایا جاتا ہے کہ وہ کون سی ترکیبیں ہیں کہ انسان خلافِ شریعت کام کرے بھی اور گناہ سے بھی بچ جائے۔ مثلاً کتاب میں لکھا ہوگا کہ جھوٹی قسم کھانا گناہ ہے۔ اور کتاب الحیل میں بتایا جائے گا کہ انسان کن الفاظ میں جھوٹی قسم کھائے کہ اس کے مواخذہ سے بچ جائے۔ ظاہر ہے کہ ان حیلوں کی حیثیت فریبِ نفس سے زیادہ کچھ نہیں۔ لیکن جو قوم ایسی فریب انگیز باتوں کو اپنی کتبِ شریعت میں درج کر کے ان پر عمل کرنے کی حوصلہ افزائی کرے، اس کی ذہنیت اور اخلاقی سطح کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

زیرِ نظر مقالہ میں دیکھئے کہ سر سیدؒ اس قسم کی "شرعی حیلہ کاریوں" کی نقاب کشائی کس انداز سے کرتے ہیں۔ یہ بھی واضح ہے کہ جب کوئی دیدہ ور شریعت کے نام پر اس قسم کی فریب کاریوں پر نگاہ ڈالے گا تو اس کے قلبِ حساس پر کس قدر شدید چوٹ لگے گی۔ درد کی یہی شدت تھی جس نے سر سیدؒ کے ہاں طنز کا انداز اختیار کیا تھا۔ انداز تو طنزیہ ہے لیکن جو کچھ کہا گیا ہے وہ سب کچھ ہماری کتبِ فقہ میں موجود ہے۔

بات کی ابتدا یوں ہوتی ہے کہ ایک فقیہہ، کسی عام مسلمان سے پوچھتا ہے کہ کیا تم مسلمان ہو۔ وہ اس کے جواب میں عام دستور کے مطابق کہتا ہے کہ "انشاء اللہ میں مومن ہوں"۔ اس پر وہ فقیہہ بگڑ جاتے ہیں۔ اور جھٹ سے کفر کا فتویٰ جڑ دیتے ہیں۔ اس مکالمہ کی ابتدا اسی پس منظر میں ہوتی ہے۔ طلوعِ اسلام)۔

کافر۔ کافر

کیوں حضرت کافر کیوں؟

تم نے کیا کہا؟

میں نے کہا "انا مومن انشاء اللہ"۔

کافر۔ کافر یوں کہو "انا مومن حقاً" اس جگہ انشاء اللہ کا لفظ نہیں کہتے۔ ایسے موقع پر یوں بولنا کفر ہے۔

پھر حضرت کس جگہ کہتے ہیں؟

قسم سے بچنے، وعدہ پورا نہ کرنے، بے گناہ دھوکا دینے، جھوٹ بولنے اور جھوٹا ہونے میں۔

حضرت پھر تو انشاء اللہ خوب اوزار ہے۔ کیا مسلمانوں کا برتاؤ اسی مسئلہ پر ہے؟

ہاں! جو پرہیزگار، مولوی، عالم، شرع پر چلنے والے ہیں، گناہوں سے بچنا چاہتے ہیں، وہ ہمیشہ اس پر خیال رکھتے ہیں۔

حضرت میں تو نہیں سمجھا۔

فقہ پڑھی ہو، اصول فقہ کو جانا ہو، عالموں کی صحبت اٹھائی ہو تو جانو۔ جاہل، کندہ ناتراش، نہ پڑھے نہ لکھے، جانو تو کیا جانو؟

حضرت آپ ہی سمجھا دیجئے۔

ارے میاں! اِن کے معنے اگر۔ شاء کے معنی چاہا۔ اللہ کے معنی تو اللہ کے ہیں ہی، مگر وہ فاعل واقع ہوا ہے جس کے معنی نے کے ہوتے ہیں۔ اب سب کو ملاؤ تو یہ معنی ہوئے "اگر چاہا اللہ نے"

اب دو مسئلے فقہ کے اور سمجھ لو۔ اگر کوئی امر کسی پر مشروط ہو اور سبب نہ پورے ہونے شرط کے ادا نہ کیا جائے تو کچھ گناہ لازم نہیں آتا۔ "اذا فات الشرط فات المشروط"۔ ایک مسئلہ ہوا؟ دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ خالق جمیعِ افعالِ عباد کا، خدا ہے۔ پس جب اِن دونوں مسئلوں کو ملا کر انشاء اللہ کے معنوں کو دیکھو . . . .

. . . . تو پھر انشاء اللہ کہنے کے بعد کچھ گناہ باقی نہیں رہتا۔

حضرت! میں مسئلے کو تو بخوبی سمجھ گیا، مگر اب تک میری سمجھ میں یہ نہیں آیا کہ گناہ کیونکر نہیں رہتا؟ کیا وہ لفظوں کے اُلٹ پھیر سے اُلٹ جاتا ہے؟

جاہل! اور کیا؟ ہماری جیب میں ایک گھڑی ہے۔ ہمارے دوست کو اس کی ضرورت ہے۔ جب اُس نے ہم سے مانگی ہم نے کہا کہ ہمارے گھر میں کوئی گھڑی ہی نہیں۔ اُس نے کہا قسم تو کھاؤ۔ ہم نے کہا خدا کی قسم ہمارے گھر میں کوئی گھڑی ہی نہیں۔

یا ہمارے گھر میں ایک اشرفی رکھی ہے۔ ہمارے دوست نے ہم سے اشرفی مانگی ہم نے کہا کہ ہمارے پاس کوئی اشرفی نہیں۔ اس نے کہا قسم تو کھاؤ۔ ہم نے کہا خدا کی قسم ہمارے پاس کوئی اشرفی نہیں۔

کیوں؟

سچ بات ہوئی کہ نہیں؟ بات ہی بات میں گناہ الٹ گیا کہ نہیں؟ یہ تو باتیں ہی باتیں ہوئیں۔ روپے پیسے، سود بیٹے کے معاملہ میں بھی لفظوں ہی کے اُلٹ پھیر سے گناہ اُلٹ جاتا ہے۔ تولہ بھر سونا سولہ روپیہ کی قیمت کا ہم سے قرض لو۔ سود سے بچنے کو کہہ لو کہ بیس تولہ چاندی لیں گے۔ سولہ تولہ چاندی میں وہی تولہ بھر سونا آیا اور چار تولہ چاندی . . . . سود میں بچ رہی اور سود نہ ہوا۔ کھوٹا سونا جس میں ذرا سا تانبے کا میل ہو، قرض دو اور اسی وزن کے برابر کھرا سونا لے لو، مال تو زیادہ کا ہاتھ لگ گیا اور سود نہ ہوا۔ مکان گروی رکھو، راہن[1] سے کہلوا لو کہ سکونت میں نے بحل کی، کرایہ کا فائدہ ہوا اور سود نہ ہوا۔ گاؤں گروی لو۔ مثلاً ہزار روپے کو جس میں دو سو روپیہ سالانہ کا فائدہ ہو۔ راہن سے اسی روپیہ سال دینے کے اقرار پر پٹہ لکھوا لو اور گاؤں پر قبضہ کر لو۔ کل منافع تحصیل کرو۔ ایک سو بیس روپیہ سال سود کے، پٹے کے نام سے بچے کہ نہیں؟ اور سود نہ ہوا۔

اب سمجھے کہ لفظوں کے اُلٹ پھیر سے گناہ پلٹ گیا کہ نہیں؟ اجی ابھی ہمارے پاس زکوٰۃ کا روپیہ آ گئے اور ہم مستطیع ہوں۔ ابھی گھر میں جا کر بیوی سے کہہ دیں

---

[1] راہن جس نے مکان گروی رکھا ہے۔

کہ ہم نے اپنا کل مال تم کو ہبہ کیا، اب مفلس ہو گئے کہ نہیں؟ باہر آویں اور زکوٰۃ کا روپیہ لے لیں۔ باتیں ہی تو ہیں لیکن ان باریکیوں کے سمجھنے کے لئے علم درکار ہے۔

بھلا حضرت یہ تو ہُوا۔ انشاء اللہ والی بات رہ گئی۔ اُس کو بھی کسی مثال سے سمجھا دو۔

ارے میاں یوں سمجھو کہ ہم نے تمہارا دل خوش کرنے کو تم سے کہہ دیا کہ ہم کل تمہارے ہاں آویں گے انشاء اللہ۔ ہمارا ارادہ آنے والے کا کچھ نہ تھا۔ یوں ہی کہہ دیا تھا۔ جب نہ گئے تو معلوم ہُوا کہ خدا نے نہیں چاہا۔ اسی لئے وعدے کو مشروط کیا تھا۔ اذا فات الشرط فات المشروط۔ بات کی بات میں گناہ ہٹ گیا۔

کبھی تم عدالت میں گواہی دینے بھی گئے ہو؟

ہاں صاحب! ایک دفعہ گیا تھا، میں نے تو جو سچ تھا وہ کہہ دیا تھا۔ مگر میرا بھائی مقدمہ ہار گیا۔ میں کیا کرتا، وہاں ایک کالی مخمل کی گول چُنٹ دار ٹوپی پہنے ہوئے گوری رنگت کا مسلمان مولوی کرسی پہ بیٹھا تھا، اس نے قسم دی کہ سچ کہنا، میں جھوٹ بولنے سے ڈر گیا سچ کہہ دیا۔

ہاں فقہ نہ جاننے سے عالموں کی صحبت نہ اٹھانے سے یہی تو نتیجہ ہوتا ہے۔ ارے جب اُس مولوی جج نے قسم دی تھی کہ سچ بولنا تو نے کہا ہوتا کہ خدا کی قسم سچ بولوں گا۔ انشاء اللہ۔ اگر وہ جج نام کا مولوی تھا اور فقہ نہ جانتا تھا تو پکار ہی کر انشاء اللہ کہہ دیا ہوتا۔ اور اگر وہ مولوی تھا اور ٹھیٹھ بدلائی آن پڑی تھی تو پکار کر کہا ہوتا کہ خدا کی قسم سچ بولوں گا اور جھٹ پٹ دل میں کہہ دیا ہوتا انشاء اللہ۔ مگر یہ خیال رکھا ہوتا کہ سانس نہ ٹوٹنے پائے ورنہ انشاء اللہ کا جوڑ ٹوٹ جاتا۔ پھر جو چاہتے وہ کہہ دیتے۔ ذرا بھی جھوٹی قسم کھانے کا گناہ نہ ہوتا!

حضرت! باتیں تو آپ نے خوب بتائیں مگر میں حیرت میں آ گیا۔ اب تو رخصت ہوتا ہوں اور کسی سے بھی تحقیق کروں گا، میرا دل دُھکڑ پکڑ کر رہا ہے۔

تم جس مولوی سے چاہنا پوچھنا، یہی بتائے گا۔ کہو میں ابھی ہدایہ، شرح وقایہ، دُرِّ مختار، بحر الرائق، نہر الفائق اور بڑے بڑے معتبر فتاووں سے ہر ایک چیز کی روایت نکال دوں۔ اور تم نے وہ فتاویٰ بھی دیکھا ہے جو پیارے خاندانی مولویوں اور قاضیوں کے ہاں ہوتا ہے۔ میں اس وقت اس کا نام بھول گیا ہوں۔ یاد آ جائے گا تو بتا دوں گا۔ اس میں ہر ایک مسئلہ کی نسبت دو روایتیں لکھی ہیں، ایک میں جائز حلال اور دوسری میں ناجائز حرام لکھ رکھا ہے۔ پھر جونسی روایت کے مطابق چاہا فتویٰ لے لیا۔ بہت ہوا، روپیہ دو روپیہ فتویٰ کے نام سے نہیں اور کسی نام سے کبھی کبھی دیتے رہے۔ کیوں؟ بات کی بات میں گناہ ہٹ گیا کہ نہیں؟

مگر اس زمانے میں جو کمبخت مقلّدین فلاسفر ملاحدہ نکلے ہیں وہ تو مذہب اسلام کی جڑ کاٹتے ہیں۔[1] یا اللہ کیا مشکل پڑی ہے!!!

---

[1] مطلب خود سرسید اور اس کے ہم نواؤں سے ہے۔ طلوعِ اسلام

لُغاتُ القرآن

یہ قرآنی الفاظ کی صرف ڈکشنری نہیں۔ یہ ان کا مستند اور واضح مفہوم پیش کرنے کے ساتھ ساتھ یہ بھی بتاتی ہے کہ ان الفاظ سے قرآن کریم کس قسم کا تصور پیش کرتا ہے اس کی تعلیم کیا ہے اس کی دعوت کیا ہے اس کی دعوت کیا ہے قرآن مجید نے انسان کو کیا دیا ہے یہ اس کا کیا مقام متعین کرتا ہے۔ چار جلدوں کی یہ کتاب قرآنی حقائق اور علوم حاضرہ کا انسائیکلوپیڈیا ہے۔ خوبصورت ٹائپ میں عمدہ سفید کاغذ پر چھپی ہے۔

قیمت: فی جلد -/۳۰ روپے
مکمل سیٹ -/۱۲۰ روپے

ادارہ طلوعِ اسلام ۲۵-بی گلبرگ ۲ - لاہور

محترم رفیع اللہ صاحب

قسط دوم

اسلامی قانون کی تدوین جدید

۲۲۔ مضاربت

"بینکوں کو مسلمان بنانے" کے لئے مضاربت کی اصطلاح کثرت سے استعمال کی جارہی ہے اور حد یہ ہے کہ یہ نظریہ پیش کرنے والے اس کی صحیح تعریف سے آگاہ نہیں ہیں۔ وہ اس سے نفع نقصان میں شرکت مراد لیتے ہیں۔ فقہا کے نزدیک اس کی تعریف یہ ہے:-

ھی فی اللغۃ عبارۃٌ اَنْ یدفع شخصٌ مالاً لِلآخر لیتجر فیہ علی اَنْ یکونَ الربح بینھما علی ماشرطا والخسارۃ علی صاحب المال۔ (الفقہ علی المذاہب الاربعۃ جلد ۳ صہ۳۴)

لغت میں مضاربت کے معنی یہ ہیں کہ ایک شخص دوسرے کو تجارت کی غرض سے سرمایہ مہیا کرے کہ نفع تو ان کے درمیان بہ مطابق حصّہ ہوگا لیکن نقصان کا ذمہ دار صرف صاحبِ مال ہوگا۔

یعنی نفع میں تو دونوں شریک ہوں گے لیکن نقصان سب کا سب سرمایہ والے کے ذمہ ہوگا بلکہ اس دوران کارندے کے اخراجات بھی سرمایہ ہی سے پورے ہوں گے۔

ونفقۃ العامل مِنَ المال فی سفرہٖ مِنْ طعامہٖ وکسوتہٖ وما یُصلحہٗ بالمعروف بقدر المال۔ (تنویر الحوالک جلد ۲ صفحہ ۸۸)

کام کرنے والے حصّہ دار کا سفر خرچ مثلاً کھانا، کپڑے وغیرہ سرمایہ کی مقدار کے لحاظ سے سرمایہ ہی سے پورے ہوں گے۔

ان اخراجات کے بعد جو نفع ہوگا وہ بمطابق حصّہ تقسیم ہوگا۔ نقصان کی صورت میں کارندہ پر کچھ لازم نہیں آتا کیونکہ مال اس کے پاس بطور امانت تصوّر کیا جاتا ہے۔ ثم المدفوع الی المضارب امانۃٌ فی یدہٖ (ھدایہ اخرین کتاب المضاربۃ صہ۲۵۷)

مضاربت کی اجازت عام نہیں بلکہ بحالت مجبوری۔

اَنَّ بالناسِ حاجۃٌ الی عقد المضاربۃ فصاحب المال قد یکونُ عاجزًا عنِ التصرف بنفسہ ۔ (المبسوط جلد ۲۳ صفحہ ۱)

مضاربت کے اصول پہ کام کرنا ایک انسانی ضرورت ہے کیونکہ بعض اوقات صاحبِ سرمایہ خود کاروبار سے عاجز ہوتا ہے ۔

یہ اجازت محدود اس لئے ہے کہ بعض ائمہ کو اس کے شرعی مسئلہ ہونے میں بھی کلام ہے ۔ قال ابن حزم فی مراتب الاجتماع کل ابواب الفقہ فلھا اصلٌ مِنَ الکتاب والسنۃ حاشا القراض فما وجدنا لہٗ اصلاً فیھا البتۃ (نیل الاوطار جلد ۵ صفحہ ۲۸۲)

علامہ ابن حزم مراتب الاجتماع میں فرماتے ہیں کہ فقہ کی ہر باب کی اصل کتاب و سنت ہے مگر مضاربت کہ ہم نے کتاب و سنت میں اس کی کوئی اصل نہیں پائی ۔

۲۳۔ سود ہمارے ہاں سود سے مراد عام طور پر بنک کا سود لیا جاتا ہے ۔ اسلام میں جو کچھ بھی بغیر محنت و کمائی کے اصل زر سے زیادہ لیا جائے وہ سود ہے ۔ کچھ مشتبہ چیزوں کے سود ہونے کی وضاحت خود نبی صلعم فرما گئے ہیں ۔ وہ چیزیں مندرجہ ذیل ہیں :۔

(۱) ربوالفضل اس کی حرمت کے متعلق اس مضمون کی کئی احادیث ہیں ۔ الذھبُ بالذھب مثلاً بمثلٍ و زناً بوزنٍ ، یداً بیدٍ والفضل ربوٰا ۔ اس کی تفصیل کتاب سود کے مصنف (ابوالاعلیٰ مودودی مرحوم) کی زبانی سنیئے :۔

"جیسا کہ ابھی ہم بیان کر چکے ہیں قدیم زمانے میں تمام سکے خالص چاندی سونے کے ہوتے تھے اور ان کی قیمت دراصل ان کی چاندی اور ان کے سونے کی قیمت ہوتی تھی ۔ اس زمانے میں درہم کو درہم سے اور دینار کو دینار سے بدلنے کی ضرورت ایسے مواقع پہ پیش آتی تھی ۔ مثلاً جب کہ کسی شخص کو عراقی درہم کے عوض رومی درہم درکار ہوتے ۔ یا رومی دینار کے بدلے ایرانی دینار کی حاجت ہوتی ۔ ایسی ضرورتوں کے مواقع پہ یہودی ساہوکار اور دوسرے ناجائز نفع کمانے والے لوگ کچھ اس طرح کا ناجائز منافع وصول کرتے تھے جیسا موجودہ زمانے میں بیرونی سکوں کے مبادلہ پر بٹاون لی جاتی ہے یا اندرونِ ملک روپیہ کی ریزگاری مانگنے والوں یا دس اور پانچ کا نوٹ بھنانے والوں سے کچھ پیسے یا آنے وصول کر لئے جاتے ہیں ۔ یہ چیز چونکہ سود خوارانہ ذہنیت کی طرف لے جانے والی ہے اس لئے نبی صلعم نے حکم دے دیا کہ نہ تو اس چاندی کا تبادلہ چاندی سے اور سونے کا تبادلہ سونے سے کمی بیشی کے ساتھ کرنا جائز ہے ۔ اور نہ ایک درہم کو دو درہم کے عوض بیچنا درست ہے ۔

(سود جدید ایڈیشن صفحہ ۱۵۷)

(۲) زمین کی بٹائی کو بھی حضورؐ نے سود قرار دیا ہے ۔ مولانا امیر علی صاحب نے تفسیر مواہب میں آیت ربوٰا کا یہی شانِ نزول بیان فرمایا ہے

ایک روایت میں حضرت رافع بن خدیج بیان کرتے ہیں کہ میں اپنی کھیتی کو پانی دے رہا تھا وہاں

سے حضورؐ کا گزر ہوا تو پوچھا یہ کس کی کھیتی ہے اور کس کی زمین ہے۔ میں نے عرض کیا۔ میری کھیتی ہے۔ اس میں تخم اور عمل میرا ہے۔ آدھی پیداوار میری ہو گی اور آدھی مالک زمین قبیلہ کی۔ آپ نے فرمایا کہ تم سود کا کاروبار کرتے ہو۔ زمین مالکوں کو واپس کر دو اور ان سے اپنا خرچ وصول کر لو۔

(سنن ابوداؤد باب المزارعۃ)

دوسری روایت بھی سنن ابوداؤد ہی کی ہے اور اس کے راوی حضرت جابرؓ بن عبداللہ ہیں۔ آپ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول خدا صلعم کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ جو شخص بٹائی نہ چھوڑے وہ اللہ اور رسول کے ساتھ لڑائی کے لئے تیار ہو جائے۔ (ایضاً)

قرآن مجید میں سود کے بارے میں یہی وعید آئی ہے۔

امام ابو حنیفہؒ، امام مالکؒ اور امام شافعیؒ کا بھی یہی مسلک ہے۔

(۳) تیسری چیز مکہ مکرمہ کے مکانوں کا کرایہ ہے۔ اس کے متعلق فرمان نبویؐ یہ ہے۔ مَنْ اَجَرَ ارض مکہ فکانما اکل الربوا ـــــ جس نے مکہ شریف کی زمین کا کرایہ وصول کیا تو اس نے گویا سود کھایا۔ حنفی فقہ کا فتویٰ بھی اسی کے مطابق ہے۔

دیکرہ اجارتہا ایضاً لقولہ علیہ السلام من اَجَرَ ارض مکۃ فکانما اکل الربوا۔

(ہدایہ اخرین کتاب الکراہیۃ صفحہ ۴۶۷)

مکہ شریف کے مکانوں کا کرایہ لینا جائز نہیں اس فرمان نبویؐ کے مطابق کہ جس نے اس کا کرایہ وصول کیا اس نے گویا سود لیا۔

۴۲۔ شرابی پر حد

اس ام الخبائث کی برائیوں سے کسی کو بھی انکار نہیں، لیکن حیرت ہے کہ جہاں قرآن مجید میں اس کو سختی سے ختم کرنے کا حکم ہے فقہ میں اس سلسلے میں بہت نرمی اختیار کی گئی ہے جس کا اندازہ مندرجہ احکام سے ہو گا۔

(۱) وَنبیذ العسل والتین و نبیذ الحنطۃ والذرۃ والشعیر حلالٌ وان لم یطبخ وھذا عند ابی حنیفۃ وابی یوسف رحمہما اللہ اذا کان من غیر لہوٍ وطربٍ لقولہ علیہ السلام الخمر من ھاتین الشجرتین واشار الی الکرمۃ والنخلۃ خصّ التحریم بہما۔ ہدایہ اخرین کتاب الاشربۃ صفحہ ۴۸۱)

شہد، انجیر، گندم، باجرہ اور جو کی غیر پختہ شراب امام ابو حنیفہؒ اور امام ابو یوسفؒ کے نزدیک جائز ہے۔ اس شرط پر کہ اس کے ساتھ لہو و لعب نہ ہو۔ کیونکہ حضور صلعم نے انگور اور کھجور کے درخت کی طرف اشارہ فرما کر کہا کہ شراب صرف ان دو درختوں سے بنتی ہے۔ اس لئے حرمت ان دو ہی کے ساتھ مخصوص ہوا۔

نیز (۲) وھو نص علی ان ما یتخذ من الحنطة والشعیر والعسل والذرة حلال عند ابی حنیفة ولا یحد شاربه عنده وان سکر منه (ایضاً ص ۴۷۸)

گندم، جَو، شہد اور باجرہ سے بنی ہوئی شراب چونکہ امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک جائز ہے اس لئے اگر اس سے نشہ بھی کیوں نہ آجائے ایسے شرابی پر حد عائد نہ ہوگی۔

(۳) ولا باس بالخلیطین لما روی عن ابن زیاد انہ قال سقانی ابن عمر شربة ماکدت اھتدی الی اھلی۔ (ایضاً)

خلیطین (ایک قسم کی شراب جو کھجور اور انگور کے عرق کو ملاکر بنائی جاتی ہے) کے استعمال میں کوئی حرج نہیں۔ جیسا کہ ابن زیاد سے روایت ہے کہ ابن عمرؓ نے مجھے کچھ ایسی چیز پلائی کہ میں خمار کی وجہ سے گھر تک کا راستہ نہ پا سکتا تھا۔

(۴) وعصیر العنب اذا طبخ حتی ذھب ثلثاہ وبقی ثلثہ حلال وان اشتد

انگوروں کا نچوڑ اس طرح پکایا جائے کہ اس کا دو تہائی خشک ہو جائے تو بقیہ ایک تہائی کا اثر خواہ کتنا ہی سخت کیوں نہ ہو وہ حلال ہے۔ (ایضاً ص ۴۸۱)

شراب کو سرکہ میں تبدیل کر دیا جائے تو وہ حلال ہو جاتا ہے چاہے وہ خود بخود سرکہ بن گیا ہو یا کسی چیز کے ڈالنے سے اور شراب کا سرکہ بنا لینے میں کوئی کراہت نہیں۔ (ایضاً ۴۸۳)

شرابی کی سزا

فان اقر بعد ذھاب رائحتھا لم یحد عند ابی حنیفة وابی یوسف (ہدایہ اولین مجیدی صفحہ ۵۰۰) اگر شرابی، شراب کی بُو ختم ہونے کے بعد اقرار کرے تو اس پر کوئی حد نہیں۔ اور ایسا شخص جس کے منہ سے شراب کی بُو تو آ رہی ہو لیکن شہادت نہ ملتی ہو اس پر کوئی حد نہیں۔ (ایضاً ۵۰۱)

ومن اقر بشرب الخمر والسکر ثم رجع لم یحد۔ اگر کوئی شراب پینے اور نشہ چڑھنے کا اقرار کر کے منکر جائے تو اس پر کوئی حد نہیں۔ (ایضاً ۵۰۲)

۲۵۔ چوری کی سزا

شراب کی طرح چوری کے احکام میں بھی زیادہ نرمی اختیار کی گئی ہے۔ چوری کے نصاب کی حد یہ ہے۔

فقہائے عراق (یعنی فقہ حنفیہ) کے نزدیک قطع ید کی حد دس درہم ہے۔ اما فقھاء العراق فالنصاب الذی یجب القطع فیہ عندھم عشرة دراھم۔ قاضی ابن ابی لیلیٰ اور ابن شبرمہ کے نزدیک یہ حد پانچ درہم ہے۔ وقد قال جماعة منھم ابن ابی لیلیٰ وابن شبرمة لا تقطع الید فی اقل من خمسة دراھم۔ بعض علماء کے نزدیک یہ حد چار درہم ہے اور عثمان البتی کے نزدیک صرف دو درہم۔ وقد قیل فی اربعة دراھم وقال عثمان البتی فی درھمین۔ امام شافعیؒ کے نزدیک یہ چوتھائی دینار ہے۔

وقال الشافعی الاصل فی تقویم الاشیاء ھو ربع الدینار وھو الاصل ایضاً للدراھم فلا یقطع عندہٗ فی الثلاثۃ دراھم الا ان تساوی ربع الدینار۔

فقہاء حجاز یعنی امام مالک وغیرہ ہم چاندی کے تین دراہم اور چوتھائی دینار پر عمل پیرا ہیں۔

مندرجہ ذیل صورتوں میں چور کو ہاتھ کاٹنے کی سزا نہ دی جائے گی۔

(۱) ولا یقطع فیما یوجد تافھاً مباحاً فی دار الاسلام کالخشب والحشیش والقصب والسمک والطیر (و فی الطیر الدجاج والبط والحمام) والصید والزرنیخ والمغرۃ والنورۃ۔

(ہدایہ مجیدی جلد ۲ صہ ۵۱۲)

دارالاسلام میں جو چیزیں کم قیمت اور عام ہوں۔ مثلاً خشک لکڑی۔ گھاس۔ بانس۔ مچھلی اور پرندے (پرندوں میں مرغی، بطخ، اور کبوتر شامل ہیں) شکار۔ ہڑتال۔ عمدہ مٹی اور چونا کی چوری پر ہاتھ نہیں کاٹے جائیں گے۔

(۲) ایسی چیزیں جو جلدی خراب ہو جاتی ہیں مثلاً دودھ۔ گوشت اور تازہ پھل، ان کی چوری پر بھی قطع ید نہ ہوگا۔ (ایضاً ۵۱۳)

(۳) ولا قطعٌ علی سارق الصبی الحر وان کان علیہ حلیٌ (ایضاً ۵۱۴)

آزاد بچہ جو زیور پہنے ہوئے ہی کیوں نہ ہو اس کی چوری (اغواء) پر کوئی حد نہیں۔

(۴) ولا یقطع السارق من بیت المال لانہ مال العامۃ (ایضاً)

بیت المال کے چور کے ہاتھ بھی نہیں کاٹے جائیں گے۔ کیونکہ وہ عوام کی مشترکہ ملکیت ہے۔

(۵) ولا قطع علی من سرق مالاً من حمامٍ او من بیتٍ اذن للناس فی دخولہ لوجود الاذن عادۃً ویدخل فی ذلک حوانیت التجارۃ والخانات الا اذا سرق منھا لیلاً لانھا بنیت للاحراز الاموال وانما الاذن یختص بالنھار (ایضاً صفحہ ۵۱۸)

جس نے حمام یا ایسی جگہ جہاں لوگوں کو عام طور پر اجازت ہے۔ مثلاً تجارتی دکانیں اور ہوٹل وغیرہ میں اگر دن کے وقت چوری کی تو اس پر کوئی حد نہیں۔

(۶) واذا نقب اللص البیت فدخل واخذ المال وناولہٗ اٰخرُ خارج البیت فلا قطعٌ علیھما۔
چور نقب لگا کر گھر میں داخل ہوا اور چوری کا مال باہر کسی اور کو پکڑا دیا تو دونوں پر قطع ید کی سزا نہیں۔ (ایضاً)

(۷) مہمان اگر میزبان کی چوری کرلے تو اس پر کوئی حد نہیں۔ (ایضاً)

(۸) وکذلک ان حملہٗ علی حمارٍ فساقہٗ واخرجہٗ۔ اس طرح اس چور کے ہاتھ بھی نہیں کاٹے جائیں گے جو نقب لگا کر اندر گیا اور چوری کا سامان گدھے وغیرہ پر لاد کر باہر لے آیا۔ (ایضاً صفحہ ۵۱۹)

(۹) وان طرَّ صُرَّۃً خارجۃً من الکم لم یقطع۔ اگر آستین سے نکلی ہوئی تھیلی کاٹ لے تو اس پر قطع ید نہیں (ایضاً)

(۱۰) وان سرق من القطار بعیراً اوحملاً لم یقطع۔ اگر اونٹوں کی قطار سے اونٹ یا اس کا بوجھ چرا لیا تو ایسے چور کا ہاتھ بھی نہیں کاٹا جائے گا۔ (ایضاً)

(۱۱) واذا ادعی السارق ان العین المسروقۃ ملکہٗ سقط القطع عنہ وان لم یقم بیّنۃً

اگر چور بلا دلیل کے یہ دعویٰ کر دے کہ چوری شدہ مال اس کی ملکیت ہے تو اس پر کوئی حد نہیں۔ (ایضاً ۵۲۳)
غرضیکہ ہدایہ کے اس باب میں اس قسم کی بیسیوں صورتیں ملتی ہیں جن پر قطع ید نہیں۔ ہمارے خیال میں تو جو چند ایک صورتیں ہم نے نقل کی ہیں اس کے بعد شاید ہی قطع ید کی کوئی ضرورت پیش آتی ہو۔

۲۶۔ حدِ زنا

زنا بھی ان جرائم کبیرہ میں سے ہے جنہیں قرآن نے قابلِ تعزیر گناہ قرار دیا ہے اور اس کے لئے کوڑوں جیسی سخت سزا کا حکم دیا ہے۔ تاہم فقہاء شادی شدہ اور غیر شادی شدہ زانی کی سزا میں فرق کرتے ہیں۔ غیر شادی شدہ زانی کی سزا تو وہی ہے جو قرآن مجید نے مقرر کی ہے۔ ہاں شادی شدہ زانی کی سزا رجم بیان کی جاتی ہے اور کہا جاتا ہے کہ یہ حکم بھی قرآن کی ایک آیت کے تحت ہے جس کی تلاوت منسوخ ہو چکی ہے لیکن حکم باقی ہے۔[1]
وہ آیت اس طرح بیان کی جاتی ہے۔

الشیخُ والشیخۃُ فارجموھما البتۃَ نکالاً مِنَ اللہ واللہ عزیزٌ حکیم۔

چنانچہ جہاں قرآن کے حکم سے زیادہ سختی اختیار کی گئی تو عملی طور پر دشواریاں پیش آئیں۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ زنا کے احکام میں اتنی نرمی اختیار کی گئی کہ قرآن مجید کی اصلی سزا کے نفاذ کا امکان بھی نہیں رہتا۔

(۱) ولاحدَّ علی مَنْ وطی جاریۃ ولدہٖ وولد ولدہٖ وان قال علمتُ انّھا علیَّ حرامٌ۔

(ھدایہ اولین مجیدی صفحہ ۴۸۹)

اگر کوئی شخص اپنے بیٹے یا پوتے کی لونڈی سے زنا کرے اور پھر یہ اقرار بھی کرے کہ اسے اس کی حرمت کا علم تھا تو پھر بھی اس پر کوئی حد نہیں۔

(۲) ومَنْ وطی اجنبیۃً فیما دون الفرج یعزّر۔ (ایضاً ۴۹۰)

جس نے کسی اجنبی عورت سے فرج کے سوا کسی دوسری جگہ زنا کیا تو اس پر حد نہیں بلکہ اسے تعزیر کی جائے گی۔

(۳) ومَنْ زنی فی دار الحرب اوفی دار البغی ثم خرج الینا لایقام علیہ الحد۔

جس نے دار الحرب یا باغیوں کے علاقہ میں زنا کیا۔ اور پھر دار الاسلام چلا آیا تو اس پر کوئی حد نہیں۔

(۴) ومَنْ اقرّ اربع مراتٍ فی مجالس مختلفۃٍ انّہٗ زنی بفلانۃٍ وقالت ھی تزوجنی اوْ اقرّت بالزنا وقال الرجل تزوجتھا فلاحدَّ علیہ وعلیہ المھر۔

اگر کسی نے مختلف مجلسوں میں یہ اقرار کیا کہ اس نے فلاں عورت سے زنا کیا لیکن عورت کہے کہ نہیں اس نے مجھ سے نکاح کیا ہے یا عورت زنا کا اقرار کرے اور مرد نکاح کا دعوے کرے تو اس پر کوئی حد نہیں تاہم وہ عورت کو حق مہر ادا کرے گا۔ (ایضاً صہ ۴۹۳)

(۵) اگر دو گواہ زنا بالجبر کی گواہی دیں اور دو کہیں کہ عورت نے اس کو اپنی طرف متوجہ کیا تو ان سب

---

[1] یعنی یہ آیت تو قرآن کریم میں موجود نہیں لیکن اس کا حکم موجود ہے۔ یا للعجب! (طلوعِ اسلام)۔

پر کوئی حد نہیں۔ (ایضاً ص ۴۹۵)

(۲) وان شہد اربعۃ انہ زنی بامراۃ بالنخیلۃ عند طلوع الشمس واربعۃ انہ زنی بہا عند طلوع الشمس بدیر ہند درئ الحد عنہم جمیعاً۔ کسی شخص کے متعلق چار گواہ اس امر کی شہادت دیں کہ اس نے بمقام نخیلہ فلاں عورت سے بوقت صبح زنا کیا اور دوسرے چار گواہوں نے یہ گواہی دی کہ اس نے یہ کام "دیر ہند" کے مقام پر صبح کے وقت کیا تو ان میں سے کسی پر حد نہ ہوگی۔

۲۷۔ بادشاہ کے خدائی حقوق

اس عقیدہ کا خلاصہ یہ ہے کہ بادشاہ خدا کی طرف سے مقرر کردہ ہیں اور یہ حکمران خدا کے سوا کسی کے سامنے جواب دہ نہیں ہیں۔ اصل میں یہ ایک یہودی عقیدہ ہے جسے انگلستان کے بادشاہ جیمز دوم نے اپنی مملکت کا دستور بنایا۔ حکمران، مذہبی گروہوں کی ملی بھگت سے وقتاً فوقتاً اس اصل سے فائدہ اٹھاتے رہے ہیں۔

الیافعی نے اپنی تاریخ میں یزید بن عبدالملک کے زمانہ کا ایک واقعہ نقل کیا ہے۔ اتوا ربعین شیخاً وشہدوا لہ ان الخلفاء لاحساب علیہم ولاعذاب۔ چالیس شیوخ (اساتذہ) نے آکر اس امر کی گواہی دی کہ خلفاء قیامت کے دن بغیر حساب کے بخشے جائیں گے۔

(تاریخ الیافعی صفحہ ۲۴۲ بحوالہ امام ابوحنیفہؒ کی سیاسی زندگی صفحہ ۶۳)

یہ عقیدہ چونکہ اسلام سے میل نہیں کھاتا اس لئے مولانا مناظر احسن گیلانی اس پر اظہار افسوس کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

(نامعلوم) اس شہادت کے ادا کرنے والے "شیخ" کس معنی کے لحاظ سے تھے؟ ان کی پیری، شیخوخیت سفیدی مو والی پیری تھی یا کیا تھی؟ بہر حال ان کو تو جانے دیجئے حیرت تو اس پر ہے کہ بڑا طبقہ محدثین کا ان ہی دنوں پیدا ہو گیا تھا جس نے اس عقیدہ کو اپنا دین بنا لیا تھا۔ ابوبکر جصاص اپنی تفسیر میں لکھتے ہیں:۔

وزعموا مع ذلک ان السلطان لاینکر علیہ الظلم والجور وقتل النفس التی حرم اللہ وانما ینکر علی غیر سلطان بالقول او بالید بغیر سلاح۔

ان لوگوں کا اس کے ساتھ یہ خیال بھی تھا کہ ظلم وجور اور بے گناہ لوگوں کے قتل وغیرہ افعال کا صدور بادشاہِ وقت سے ہو تو اس کے خلاف آواز بلند کرنا شرعاً صحیح نہیں ہے۔ ہاں بادشاہوں کے سوا عوام کو ٹوکا جا سکتا ہے اور وہ بھی صرف زبان کی حد تک۔ ہتھیار تو بہر حال کسی کے مقابلہ میں اٹھانا شرعاً جائز نہیں ہیں۔ (احکام القرآن جلد ۲ صفحہ ۳۴ بحوالہ حضرت امام ابوحنیفہؒ کی سیاسی زندگی ص ۶۳)

تھوڑی سی نرمی کے ساتھ یہ عقیدہ حنفی فقہ میں بھی موجود ہے۔

وکل شیئٍ صنعہ الامام الذی لیس فوقہ امام فلاحد علیہ الا القصاص۔

ایسا امیر جس کے اوپر کوئی دوسرا امیر نہیں، قتل کے سوا جو جرم بھی کرے تو اس پر کوئی حد نہیں۔

(ہدایہ اولین مجیدی صفحہ ۴۹۳، باب الوطئ الذی یوجب الحد والذی لا یوجبہ)

۲۸۔ محرابِ مسجد

ہمارے ہاں ہر مسجد میں محراب ہے لیکن بعض ائمہ اس کا مسجد میں ہونا مکروہ سمجھتے ہیں۔

علامہ ابن حزم فرماتے ہیں وتکرہ المحاریب فی المساجد کہ مسجدوں میں محراب بنانا مکروہ ہے۔ اما المحاریب محدثۃ و انما کان رسول اللہ صلعم یقف وحدہ ویصف الصف الاول خلفہ " محرابیں نیا اضافہ ہیں جو عہد نبویؐ میں نہیں تھیں۔ ایک صف میں خود حضورؐ کھڑے ہوتے اور دوسری صف آپ کے پیچھے بنتی۔

(المحلی لابن حزم جلد ۴ صفحہ ۲۳۹)

حضرت علی ابنؓ طالب بھی مسجدوں میں محراب ناپسند کرتے تھے۔ وعن علی ابن طالب انہ کان یکرہ المحراب فی المسجد۔ (ایضاً)

امام ابراہیمؒ نخعیؒ امام کے طاقچہ (محراب) میں نماز پڑھنا مکروہ سمجھتے تھے اور سفیان الثوریؒ فرماتے ہیں کہ ہم بھی اسے مکروہ خیال کرتے ہیں۔ (ایضاً۔ ۲۴۰)

وعن کعب یکون فی اخر الزمان قومٌ تنقص اعمارھم یزینون مساجدھم ویتخذون لھا مذابح کمذابح النصاری فاذا فعلوا ذلک صبت علیھم البلاءُ وھو قول محمد بن الجریر الطبری وغیرہٗ۔

حضرت کعب سے روایت ہے کہ آخری زمانے میں ایک قوم ہوگی جن کی عمریں کم ہوں گی اور وہ اپنی مساجد کو سجائیں گے۔ اور اس میں نصاریٰ جیسی قربان گاہیں یعنی محراب بنائیں گے۔ جب وہ ایسا کریں گے تو ان پہ مصیبت ٹوٹ پڑے گی اور محمد بن جریر الطبری وغیرہم کا بھی یہی مسلک ہے۔ (ایضاً)۔

۲۹۔ تصویر کا شرعی حکم

ائمہ اربعہ صرف اسی تصویر کو حرام کہتے ہیں جس کا سایہ ہو یعنی وہ مجسم ہو۔ بغیر سایہ کے تصویر ائمہ اربعہ کے نزدیک جائز ہے۔

الحنفیہ قالوا تصویر غیر الحیوان من شجرٍ و نحوہٖ جائزٌ۔ اما تصویر الحیوان فان کان علی بساطٍ او وسادۃٍ او ثوبٍ مفروشٍ او ورقٍ فانہٗ جائزٌ لان الصورۃ فی ھذہٖ الحالۃ تکون ممتھنۃً وکذلک یجوز اذا کانت الصورۃ ناقصۃ عضوا لا یمکنُ ان تعیش بدونہٖ کالراس و نحوھا۔

غیر جاندار اشیاء مثلاً درخت وغیرہ کی تصویر جائز ہے اور اگر جاندار اشیاء کی تصاویر چٹائی، تکیہ، دری یا کاغذ پہ ہوں تو وہ بھی جائز ہیں۔ کیونکہ ان صورتوں میں تصویر کے احترام کا کوئی پہلو ہی نہیں۔ اس طرح ایسی تصویر جس میں ایسا عضو نہ ہو جس کے بغیر جاندار زندہ نہ رہ سکتا ہو مثلاً سر وغیرہ تو ایسی تصویر بھی جائز ہے)۔ (الفقہ علی المذاہب الاربعۃ جلد ۲ صفحہ ۴۱)

امام مالکؒ کا مذہب اور بھی واضح اور مفصل ہے۔ ان کے نزدیک کسی جاندار چیز کی تصویر کی حرمت کے لئے چار

شرائط کا پایا جانا لازمی ہے۔

پہلی شرط:- احدھا ان تکون الصورۃ لحیوانٍ سواءٌ عاقلاً او غیر عاقلٍ۔ حرمت کی پہلی شرط یہ ہے کہ وہ کسی عاقل یا غیر عاقل جاندار کی ہو۔

دوسری شرط:- یہ ہے کہ وہ تصویر مجسم ہو۔ ان تکون مجسدۃً۔ (ایضاً صفحہ ۴۰)

اما اذا لم تکن مجسدۃً کصُوَرِ الحیوان والانسان التی ترسم علی الورق والثیاب والحیطان والسقف ونحو ذلک ففیھا خلاف بعضھم یقولُ انھا مباحۃٌ مطلقۃ بلا تفصیلٍ و بعضھم یقول انھا مباحۃٌ اِذا کانت علی الثیاب التی تستعمل فرشاً (ایضاً)

اگر حیوان یا انسان کی تصاویر مجسم نہ ہوں یعنی وہ کسی کاغذ، کپڑے یا دیوار یا چھت وغیرہ پر ہوں تو اس میں اختلاف ہے۔ بعض مالکیہ کے نزدیک تو یہ مطلقاً جائز ہے۔ بعض صرف اس صورت میں جواز کے قائل ہیں جب کہ وہ بطورِ فرش استعمال ہوں۔

تیسری شرط:- حرمت کی تیسری شرط تصویر کا مکمل الاعضاء ہونا ہے۔

ثالثھا اَن تکون کاملۃ الاعضاءِ الظاھرۃ التی لایمکنُ ان یعیشُ الحیوان والانسان بدونھا فان ثُقِبَتْ بطنُھا او راسھا او نحو ذلک فانھا لاتحرمُ۔ (ایضاً)

تیسری شرط یہ ہے کہ تصویر کے تمام ایسے ظاہری اعضاء مکمل ہوں جن کے بغیر انسان یا حیوان کا جینا ممکن نہ ہو۔ مثلاً اگر اس تصویر کا پیٹ یا سر وغیرہ اڑا دیا جائے تو ایسی تصویر حرام نہ ہوگی۔

چوتھی شرط:- چوتھی شرط یہ ہے کہ اس تصویر کا سایہ نہ ہو۔

رابعھا اَن تکون لھا ظلٌّ فان کانت مجسدۃً ولکن لاظلٌّ لھا بان بنیت فی الحائط ولم یظھر منھا سوی شیءٍ لاظلٌّ لہٗ فانھا لا تحرمُ

حرمتِ تصویر کی چوتھی شرط یہ ہے کہ تصویر سایہ دار نہ ہو۔ اور اگر مجسم تصویر بھی بغیر سایہ کے ہو۔ مثلاً وہ دیوار میں اس طرح بنائی گئی ہو کہ اس کا صرف وہ حصہ نظر آئے جس کا سایہ نہ ہو تو اس صورت میں بھی تصویر جائز ہوگی۔ (ایضاً)

ان شرائط کو مدِنظر رکھا جائے تو فوٹو کی حرمت کا تو سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔

حنابلہ حنابلہ بھی تقریباً یہی مسلک ہے کہ اگر تصویر مکمل الاعضاء نہ ہو تو جائز ہے۔

فاذا کان مجسدًا ولکن ازیل منہ مالاتبقی منہٗ الحیات کالراس ونحوھا فانھا مباحٌ۔

یعنی تصویر اگر مجسم ہو لیکن اس کا ایسا حصہ اڑا دیا جائے جس کے بغیر زندگی ناممکن ہو مثلاً سر وغیرہ۔ تو ایسی تصویر جائز ہے۔

یں بھی مکمل اعضاء نہیں ہوتے۔ اس لئے اس اصول کے مطابق جائز ہے۔

شافعیہ واذا کان مجسدًا فانہٗ یحلُّ التفرج علیہ اِذا کان علی ھیئۃٍ لایعیش بھا کان

کان مقطوع الراس او الوسط او ببطنہ ثقبٌ و من ھذا العلم جواز التفرج علی خیال الظلّ (السماء) اذ المرء یشتمل علی مصدر آخر لانھا صورۃٌ ناقصۃٌ۔

مجسم تصویر کا کوئی ایسا عضو مثلاً سر، پیٹ یا جسم کا درمیانی حصہ اڑا ہوا ہو کہ اس کے بغیر زندگی نامکمل ہو تو ایسی تصویر جائز ہے اس اصول کے ماتحت جاننا چاہیئے کہ پردۂ فلم پر عکس بھی ناجائز نہ ہوگا بشرطیکہ اس میں کوئی اور حرام چیز ہو۔ کیونکہ پردہ پر ناقص صورت ہی پڑتی ہے۔

(الفقہ علی المذاہب الاربعۃ جلد ۲ صفحہ ۴۲)

استدراک

دین ایک نظامِ زندگی کا نام ہے جس میں ہر اختلافی معاملہ کا فیصلہ اس نظام کی مرکزی اتھارٹی کی طرف سے ہوتا ہے۔ اس طرح امت میں کسی قسم کا اختلاف اور تفرقہ پیدا نہیں ہو سکتا۔ اختلاف کو قرآنِ کریم نے خدا کا عذاب اور تفرقہ کو شرک قرار دیا ہے۔ اس نظام کو سب سے پہلے رسول اللہ نے قائم فرمایا اور حضور کے سچے جانشینوں نے اسے آگے چلایا۔ جب تک یہ نظام قائم رہا امت میں کسی قسم کے اختلاف کا سوال پیدا نہ ہوا۔ جب اس نظام کا شیرازہ بکھر گیا اور خلافت کی جگہ ملوکیت نے لے لی تو دین، مذہب کی سطح پر اتر آیا اور اجتماعی نظامِ زندگی کی جگہ انفرادی مسلک بن کر رہ گیا۔ اس کا نتیجہ یہ تھا کہ متنازعہ فیہ معاملات میں مختلف اربابِ تفقہ نے اپنی اپنی صوابدید کے مطابق فیصلے دینے شروع کر دیئے اور عوام نے انہی فیصلوں کی اطاعت اختیار کر لی۔ دینی لامرکزیت میں اس کے سوا چارہ ہی کیا تھا۔ اسی دور میں اس قسم کی روایات وضع ہوئیں کہ "شریعتِ اسلامیہ تین سو ساٹھ طریقوں کے مطابق آئی ہے۔ ان میں سے کوئی سا طریقہ بھی اختیار کر لینا "نجات" کے لئے کافی ہے"۔ جیسا کہ اوپر کہا گیا ہے، دینی لامرکزیت میں اس کے سوا چارہ ہی نہ تھا لیکن مصیبت یہ ہوئی کہ، بجائے اس کے کہ یہ سمجھا جاتا کہ اسلام کا منشاء یہ نہیں تھا، تصور یہ کر لیا گیا کہ یہی طریق عین مطابق اسلام ہے۔ اب ظاہر ہے کہ جب "شریعت کے تین سو ساٹھ طریقوں" کو عین مطابق اسلام سمجھ لیا جائے تو امت میں وحدت کس طرح پیدا ہو سکتی ہے؟ اختلاف (یعنی خدا کے اس عذاب) سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ

(۱) سب سے پہلے اسے اچھی طرح ذہن نشین کر لیا جائے کہ اسلام میں شریعت کا ایک اور صرف ایک ہی طریقہ ہے۔ مختلف طریقے خدا کا عذاب ہیں۔

(۲) شریعت کے ایک طریق کی صورت صرف یہ ہے کہ ملک میں اسلامی نظام قائم کیا جائے۔

(۳) اسلامی نظام کے معنی یہ ہیں کہ قرآن کریم کو ـــــ جو مسلمانوں کے تمام فرقوں کے نزدیک متفق علیہ سرچشمۂ قانون ہے ـــــ قوانین کی بنیاد تسلیم کر لیا جائے اور اس کی روشنی میں اپنی ضروریات کے مطابق ایسے قوانین وضع کئے جائیں جن کا اطلاق تمام فرقوں پر یکساں طور پر ہو۔

(۴) ہر اختلافی معاملہ کا فیصلہ، مملکت کے قائم کردہ مرکزِ قوانین کی طرف سے ہو۔

پاکستان میں اس قسم کی وحدت پیدا ہو جانے کے امکانات تھے۔ لیکن ہمارے مذہبی طبقہ کی مفاد پرستیاں اس کے راستے میں سنگِ گراں بن کر حائل ہیں۔ ۱۹۶۲ء کے آئین میں الگ الگ فرقوں کے وجود کو تسلیم نہیں کیا گیا تھا۔ اور یہ وحدتِ امت کی طرف ایک اچھا قدم تھا۔ لیکن حضرات علمائے کرام نے مسلسل جہاد سے اس شق کو منسوخ کرا کر آئین میں یہ ترمیم کرالی ہے کہ پرسنل لاز میں ہر فرقہ کی کتاب و سنت کی تعبیر الگ تسلیم کر لی جائے گی۔ اور پبلک لاز کا ضابطہ، کتاب و سنت کے مطابق مرتب ہو گا جس کا اطلاق تمام مسلمانوں پر یکساں ہو گا۔ بیس برس کی منالطہ آفرینی کے بعد اس کا اعتراف کیا گیا کہ کتاب و سنت کی رو سے کوئی ضابطہ قوانین ایسا مرتب نہیں ہو سکتا جسے تمام فرقے متفقہ طور پر اسلامی تسلیم کر لیں۔

اس پر سوال پیدا ہوا کہ پھر پبلک لاز کا ضابطۂ قوانین کس طرح مرتب کیا جائے؟ جواب دیا گیا کہ اس کے لئے فقہ حنفی کا نفاذ کر دیا جائے۔ اس پر غیر حنفی فرقوں نے احتجاج کیا کہ جس فقہ کو ہم اسلامی تسلیم نہیں کرتے اس کے قوانین کو ہم اسلامی کیسے سمجھ لیں اور ان کی اطاعت بحیثیت اسلامی قوانین کس طرح کریں؟

اور قوانین سازی کی گاڑی اسی مقام پر رکی ہوئی ہے۔

اس مقالہ میں جو روایات اور فقہ کے احکام درج کئے گئے ہیں ہم نے انہیں بلا تنقید شائع کر دیا ہے۔ اس کے یہ معنی نہیں کہ ہم ان سب کو صحیح سمجھتے ہیں۔ سوچئے کہ جس قوم کی کیفیت یہ ہو وہ اختلاف کے عذاب سے کس طرح چھٹکارا پا سکتی ہے؟ (طلوعِ اسلام)

نظامِ ربوبیت

شائع ہو گئی

(یہ پچھلے ایڈیشن سے کہیں مختلف ہے)

آپ ایک عرصہ سے سنتے چلے آ رہے ہیں کہ اسلام، نہ نظامِ سرمایہ داری کا حامی ہے نہ کمیونزم کا۔ اس کا اپنا منفرد معاشی نظام ہے۔ جس میں نوعِ انسان کی مشکلات کا حل مضمر ہے۔ لیکن کسی نے یہ نہ بتایا کہ اسلام کا وہ معاشی نظام ہے کیا؟

مفکرِ قرآن، پرویز صاحب کی اس تصنیف میں نہایت وضاحت سے بتایا گیا ہے۔

(۱) نظامِ سرمایہ داری کیا ہے؟ کمیونزم اور سوشلزم کے نظام کیا ہیں۔ اور یہ کیوں ناکام رہ گئے ہیں اور ان کے برعکس (۲) اسلام کا وہ معاشی نظام کیا ہے جو نوعِ انسانی کی مشکلات کا اطمینان بخش حل پیش کرتا ہے —— اس کتاب کے بعد آپ کو معاشیات کے موضوع پر کسی دوسری کتاب کی ضرورت نہیں رہے گی۔

* کتاب آفسٹ کی چھپائی میں ولائتی سفید کاغذ پر طبع ہوئی ہے —— ضخامت ساڑھے چار سو صفحات —— سنہری جلد —— قیمت فی جلد پچاس روپے علاوہ محصول ڈاک *

ملنے کا پتہ

ادارہ طلوعِ اسلام بی ۲۵ گلبرگ ۲ لاہور ⊖ مکتبہ دین و دانش چوک اردو بازار لاہور

مکافاتِ عمل

حذر اے چیرہ دستاں سخت ہیں فطرت کی تعزیریں

دولت، قوت اور اقتدار کا نشہ خدا فراموش انسان کو بُری طرح بدمست کر دیتا ہے۔ وہ پھر نہ قانون اور قاعدے کی پرواہ کرتا ہے، نہ کسی اخلاقی ضابطہ یا انسانی قدر کا احترام۔ قانون اور قاعدے کو منوانے والی مشینری اس کی مٹھی میں ہوتی ہے اور اس کے سوا وہ کسی قوت کو تسلیم ہی نہیں کرتا جو اس کی بے مہاروی پر گرفت کر سکے۔ ان لوگوں کو اس کا خیال تک بھی نہیں آتا کہ ان سے کوئی بازپرس کرنے والا ہے (اِنَّهُمْ كَانُوا لَا يَرْجُونَ حِسَابًا ۷۸/۲۷)۔ حالانکہ خدا کا قانونِ مکافات ان کی گھات میں ہوتا ہے (اِنَّ جَهَنَّمَ كَانَتْ مِرْصَادًا ۷۸/۲۱)۔ وہ نہایت اطمینان سے اپنی سرکشی اور جرائم پیشگی میں آگے بڑھتے چلے جاتے ہیں تا آنکہ ان کے اعمال کے نتائج کے ظہور کا وقت آ جاتا ہے اور مکافاتِ عمل کی محکم گرفت (بطش شدید) انہیں اس طرح اچانک دبوچ لیتی ہے کہ ان کے ذہن میں ہی نہیں آتا کہ ہوا کیا؟ (فَيَأْتِيَهُمْ بَغْتَةً وَّهُمْ لَا يَشْعُرُوْنَ ۲۶/۲۰۲)۔ یہ عذاب ایسے مقام سے آتا ہے جو ان کے سان گمان میں بھی نہیں ہوتا۔ (وَ اَتٰهُمُ الْعَذَابُ مِنْ حَيْثُ لَا يَشْعُرُوْنَ ۳۹/۲۵)۔ وہ اسے دیکھ کر بھاگنا چاہتے ہیں (فَلَمَّآ اَحَسُّوْا بَاْسَنَآ اِذَا هُمْ مِّنْهَا يَرْكُضُوْنَ ۲۱/۱۲) لیکن انہیں آواز دی جاتی ہے کہ لَا تَرْكُضُوْا۔ مت بھاگو۔ تم بھاگ کر کہیں نہیں جا سکتے۔ وَارْجِعُوْٓا اِلٰى مَآ اُتْرِفْتُمْ فِيْهِ وَمَسٰكِنِكُمْ۔ تم پلٹ کر وہیں چلو جہاں تم نے ہر جائز و ناجائز طریقے سے دولت سمیٹ کر اپنے عیش و عشرت کا سامان اکٹھا کیا تھا۔ چلو انہی محلات میں جن کی تزئین و آرائش غریبوں کے خونِ جگر کی رنگینی سے کی گئی تھی۔ لَعَلَّكُمْ تُسْئَلُوْنَ (۲۱/۱۳)۔ چلو وہاں، تاکہ تم سے پوچھا جائے کہ یہ مال و دولت کہاں سے آیا تھا؟ تم سمجھتے تھے کہ تمہیں تمہاری ظلم کوشیوں اور عیش سامانیوں کے متعلق کوئی پوچھنے والا ہی نہیں۔ آج تم سے ان سب کے متعلق پوچھا جائے گا۔ (ثُمَّ لَتُسْئَلُنَّ يَوْمَئِذٍ عَنِ النَّعِيْمِ ۱۰۲/۸)۔ تم دولت کے انبار در انبار اکٹھے کرتے چلے جاتے تھے (اِنَّهُمْ كَانُوْا قَبْلَ ذٰلِكَ مُتْرَفِيْنَ ۵۶/۴۵) اور اپنی سرکشی اور جرائم پیشگی پر مُصر تھے (وَكَانُوْا يُصِرُّوْنَ عَلَى الْحِنْثِ الْعَظِيْمِ ۵۶/۴۶)۔ بجائے اس کے کہ تمہیں ارتکابِ جرائم پر شرم آتے تم اپنی کامیابیوں اور کامرانیوں پر خوشیاں مناتے اور اپنی دست درازیوں پر فخر کرتے تھے (ذٰلِكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَفْرَحُوْنَ فِي الْاَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ وَبِمَا كُنْتُمْ تَمْرَحُوْنَ ۴۰/۷۵)۔ تم سے کہا گیا تھا کہ تم اپنی فاضلہ دولت سے غریبوں اور محتاجوں کی روزی کا بندوبست کرو لیکن تمہیں یہ اپنا فریضہ کبھی بھولے سے بھی یاد نہ آیا۔ غریب اور نادار فاقوں مر رہے تھے لیکن تمہیں ان کا کبھی خیال تک نہ آتا تھا (وَلَمْ نَكُ نُطْعِمُ الْمِسْكِيْنَ ۷۴/۴۴) تم انہیں محض اپنی باتوں سے خوش کر دیا کرتے تھے۔ تم سمجھتے تھے کہ محض باتیں بنانے سے تم اپنی

ذمہ داری سے سبکدوش ہو جاؤ گے (وَكُنَّا نَخُوضُ مَعَ الْخَائِضِينَ ۷۴/۴۵)۔ تم عوام کی فلاح و بہبود کے لئے ایک تنکا بھی نہیں توڑا کرتے تھے لیکن چاہتے یہ تھے کہ لوگ تمہاری تعریف و توصیف کے سپاسنامے تمہاری خدمت میں پیش کریں اور زندہ باد کے نعروں سے آسمان کو گونجا دیں (وَيُحِبُّونَ أَن يُحْمَدُوا بِمَا لَمْ يَفْعَلُوا ۳/۱۸۷)۔ تم قوم کی فلاح و بہبود کی بجائے دولت سمیٹنے کی فکر میں غلطاں و پیچاں رہتے تھے اور جو کچھ ہاتھ لگتا اسے تجوریوں میں جمع کر کے اس پر تالے نہیں مہریں لگا دیا کرتے تھے (وَجَمَعَ فَأَوْعَىٰ ۷۰/۱۸)۔ ہوسِ اقتدار اور خواہشِ زراندوزی میں تم ایک دوسرے سے آگے بڑھ جانا چاہتے تھے اور اس میدانِ مسابقت (RACE COURSE) کا کوئی آخری کنارہ ہی نہ تھا جہاں پہنچ کر تم رک جاتے (أَلْهَاكُمُ التَّكَاثُرُ حَتَّىٰ زُرْتُمُ الْمَقَابِرَ ۱۰۲/۱-۲)۔ تم اس نشہ میں اس قدر بدمست ہو رہے تھے کہ تمہیں اس کا احساس تک نہیں ہوتا تھا کہ جو کچھ تم اس طرح جمع کرتے چلے جاتے ہو وہ مال و دولت نہیں، جہنم کی آگ ہے جس سے تم اپنے پیٹ بھر رہے ہو۔ (أُولَٰئِكَ مَا يَأْكُلُونَ فِي بُطُونِهِمْ إِلَّا النَّارَ ۲/۱۷۴)۔ اگر تمہاری آنکھوں پر سے ذرا بھی پردے سرک جاتے تو تم جہنم کی آگ کا فوراً مشاہدہ کر لیتے (لَتَرَوُنَّ الْجَحِيمَ ثُمَّ لَتَرَوُنَّهَا عَيْنَ الْيَقِينِ ۱۰۲/۶-۷)۔ اس لئے کہ یہ جہنم کہیں دور نہ تھی تمہیں چاروں طرف سے گھیرے ہوئے تھی (وَإِنَّ جَهَنَّمَ لَمُحِيطَةٌ بِالْكَافِرِينَ ۹/۴۹)۔ تم ایک ثانیہ کے لئے بھی اس کی نظروں سے اوجھل نہیں ہوتے تھے (وَمَا هُمْ عَنْهَا بِغَائِبِينَ ۸۲/۱۶)۔ تم دولت سمیٹ کر اپنے ... (BANK BALANCES) کا حساب کیا کرتے تھے (جَمَعَ مَالًا وَعَدَّدَهُ ۱۰۴/۲) اور مطمئن تھے کہ یہ دولت تم پر کوئی آنچ نہیں آنے دے گی (يَحْسَبُ أَنَّ مَالَهُ أَخْلَدَهُ ۱۰۴/۳)۔ اب دیکھو کہ یہی نوٹوں کے بنڈل کس طرح وہ آگ بھڑکاتے ہیں جس کے شعلے تمہارے دلوں کو اپنی لپیٹ میں لے لیں گے (نَارُ اللَّهِ الْمُوقَدَةُ الَّتِي تَطَّلِعُ عَلَى الْأَفْئِدَةِ ۱۰۴/۶-۷)۔ اب اس آگ میں اُن روپوں کو تپایا جائے گا جو تمہاری تحویل میں اس لئے دیئے گئے تھے کہ تم انھیں فلاحِ عامہ کے لئے صرف کرو لیکن تم نے انہیں اپنے باوا کی میراث سمجھ کر اپنے خزانے بھر لئے۔ انہیں تپایا جائے گا اور ان سے تمہیں داغ دیا جائے گا (يَوْمَ يُحْمَىٰ عَلَيْهَا فِي نَارِ جَهَنَّمَ فَتُكْوَىٰ بِهَا جِبَاهُهُمْ وَجُنُوبُهُمْ وَظُهُورُهُمْ هَٰذَا مَا كَنَزْتُمْ لِأَنفُسِكُمْ فَذُوقُوا مَا كُنتُمْ تَكْنِزُونَ ۹/۳۵)۔ یہ اس لئے کہ اس کلنک کے ٹیکے سے تم دور سے پہچانے جاؤ کہ تم جرائم پیشہ ہو اور کسی شریف معاشرے میں رہنے کے قابل نہیں (يُعْرَفُ الْمُجْرِمُونَ بِسِيمَاهُمْ ۵۵/۴۱)۔ تم کام تو کرتے تھے مجرموں والا لیکن معاشرے میں بڑے شریف اور معزز بنے رہتے تھے۔ اب تمہارا حقیقی چہرہ، جس پر ذلت اور رسوائیوں کی سیاہی چھا رہی ہے، بے نقاب ہو جائے گا (وَتَرْهَقُهُمْ ذِلَّةٌ ... كَأَنَّمَا أُغْشِيَتْ وُجُوهُهُمْ قِطَعًا مِّنَ اللَّيْلِ مُظْلِمًا ۱۰/۲۷) اور تمھیں اس سے کہیں پناہ نہیں مل سکے گی (مَا لَهُم مِّنَ اللَّهِ مِنْ عَاصِمٍ ۱۰/۲۷)۔

تم اگر چاہو کہ دنیا بھر کی دولت دے کر بھی اپنے کئے کی سزا سے بچ جاؤ تو ایسا نہیں ہو سکے گا۔ نہ ہی تمہاری جگہ تمہارا کوئی عزیز رشتہ دار تمہاری سزا بھگت سکے گا۔ جس نے کیا ہے اسی کو بھگتنا پڑے گا (يَوَدُّ الْمُجْرِمُ لَوْ يَفْتَدِي مِنْ عَذَابِ يَوْمِئِذٍ بِبَنِيهِ وَصَاحِبَتِهِ وَأَخِيهِ وَفَصِيلَتِهِ الَّتِي تُؤْوِيهِ وَمَن فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا ثُمَّ يُنجِيهِ كَلَّا ... ۷۰/۱۱-۱۳)۔ نہ ہی اب کسی کی سفارش چل سکے گی (فَمَا تَنفَعُهُمْ شَفَاعَةُ الشَّافِعِينَ ۷۴/۴۸)۔

تمہارا یہ خیال بھی خام ہے کہ تمہارا کوئی عزیز، رشتہ دار، یا دوست تمہاری جگہ پھانسی کا رسّہ اپنے گلے میں ڈال کر تمہیں چھڑا لے گا۔ اس بکڑا دھکڑی میں کوئی دوست دوسرے دوست کو نہیں پہچانے گا (وَلَا يَسْـَٔلُ حَمِيْمٌ حَمِيْمًا ۔ ۷۰/۱۰)۔
تم یہ نہ سمجھو کہ جو کچھ تم نے کیا ہے اس کا کہیں ثبوت نہیں ملے گا۔ تمہارا اعمال نامہ تمہارے سامنے ہے۔ اسے خود پڑھ لو (اِقْرَاْ كِتٰبَكَ ۔ كَفٰى بِنَفْسِكَ الْيَوْمَ عَلَيْكَ حَسِيْبًا ۔ ۱۷/۱۴)۔ اگر گواہوں کی ضرورت ہو تو تمہارے ہاتھ پاؤں تمہارے خلاف گواہی دیں گے (اَلْيَوْمَ نَخْتِمُ عَلٰٓى اَفْوَاهِهِمْ وَتُكَلِّمُنَآ اَيْدِيْهِمْ وَتَشْهَدُ اَرْجُلُهُمْ بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ۔ ۳۶/۶۵)۔ تم سمجھتے ہو کہ جو سمگل کیا ہوا سونا تم نے چھپا کر رکھا ہے وہ کسی کو نہیں مل سکتا۔ ہمارے پاس اس کا بھی علاج ہے۔ تم اگر اپنے جرم سے انکار کرتے ہو تو تمہیں ایسے کپڑے پہنائے جائیں گے جس سے تمہارا جسم جھلس جائے۔ تمہارے سر پہ کھولتا ہوا پانی ڈالا جائے گا جس سے تمہارا چھپایا ہوا سونا پگھل کر باہر آ جائے گا (فَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا قُطِّعَتْ لَهُمْ ثِيَابٌ مِّنْ نَّارٍ ۔ يُصَبُّ مِنْ فَوْقِ رُءُوْسِهِمُ الْحَمِيْمُ ۔ يُصْهَرُ بِهٖ مَا فِيْ بُطُوْنِهِمْ وَالْجُلُوْدُ ۔ وَلَهُمْ مَّقَامِعُ مِنْ حَدِيْدٍ ۔ ۲۲/۱۹-۲۰-۲۱)۔ جب تمہیں الٹا لٹکایا جائے گا تو سب اگلا ہوا اگل دو گے (يَوْمَ تُقَلَّبُ وُجُوْهُهُمْ فِي النَّارِ ۔ ۳۳/۶۶)۔
حکم دیا جائے گا کہ اسے گرفتار کر لو۔ کہیں بھاگ نہ جائے۔ اس کے گلے میں طوق، ہاتھوں میں ہتھکڑیاں اور پاؤں میں بیڑیاں ڈالو اور اسے جہنم میں پہنچا دو (خُذُوْهُ فَغُلُّوْهُ ۔ ثُمَّ الْجَحِيْمَ صَلُّوْهُ ۔ ثُمَّ فِيْ سِلْسِلَةٍ ذَرْعُهَا سَبْعُوْنَ ذِرَاعًا فَاسْلُكُوْهُ ۔ ۶۹/۳۰-۳۲)۔ یعنی تنگ و تاریک کوٹھڑی میں بند کر دو (وَاِذَآ اُلْقُوْا مِنْهَا مَكَانًا ضَيِّقًا مُّقَرَّنِيْنَ ... ۲۵/۱۳)۔ خود نہیں جاتا تو اسے گھسیٹ کر لے جاؤ (خُذُوْهُ فَاعْتِلُوْهُ اِلٰى سَوَآءِ الْجَحِيْمِ ۔ ۴۴/۴۷) جس طرح جانوروں کو ہانک کر لے جاتے ہیں (وَنَسُوْقُ الْمُجْرِمِيْنَ اِلٰى جَهَنَّمَ وِرْدًا ۔ ۱۹/۸۶)۔ یہ خطرناک قسم کا مجرم ہے، اس لئے اس پر ایسے وارڈر مقرر کرو جو مضبوط اور سخت قسم کے واقع ہوں (عَلَيْهَا مَلٰٓئِكَةٌ غِلَاظٌ شِدَادٌ ۔ ۶۶/۶) ایسے کہ جو کچھ ان سے کہا جائے اس کے مطابق فوراً عمل کریں اور اس میں ذرا بھی کوتاہی یا سرتابی نہ کریں (لَّا يَعْصُوْنَ اللّٰهَ مَآ اَمَرَهُمْ وَيَفْعَلُوْنَ مَا يُؤْمَرُوْنَ ۔ ۶۶/۶)۔
جہنم میں اس قدر چیخ و پکار ہو گی کہ کوئی کسی دوسرے کی بات نہیں سن سکے گا (لَهُمْ فِيْهَا زَفِيْرٌ وَّهُمْ فِيْهَا لَا يَسْمَعُوْنَ ۔ ۲۱/۱۰۰)۔ جہنم تو سب کے لئے ایک ہی ہو گا لیکن جرائم کی نوعیت کے اعتبار سے مختلف مجرموں کے لئے داخلے کے دروازے مختلف ہوں گے (وَاِنَّ جَهَنَّمَ لَمَوْعِدُهُمْ اَجْمَعِيْنَ ۔ لَهَا سَبْعَةُ اَبْوَابٍ ۔ لِكُلِّ بَابٍ مِّنْهُمْ جُزْءٌ مَّقْسُوْمٌ ۔ ۱۵/۴۳-۴۴)۔ سنگین مجرموں کو اس میں بھی بیڑیوں میں جکڑ کر رکھا جائے گا (اِنَّ لَدَيْنَآ اَنْكَالًا ۔ ۷۳/۱۲)۔ کھانے کے لئے وہاں وہ کچھ ملے گا جو حلق میں اٹک کر رہ جائے، نہ اگلا جائے نہ نگلا جائے (وَطَعَامًا ذَا غُصَّةٍ ۔ ۷۳/۱۳ نیز ۸۸/۷) ایسا کہ جس سے نہ شکم سیری ہو، نہ ہی وہ جزو بدن بن سکے (لَا يُسْمِنُ وَلَا يُغْنِيْ مِنْ جُوْعٍ ۔ ۸۸/۷)۔ بڑے بڑے "معززین" حرام کی کمائی سے ناز و نعمت میں پلے تھے۔ اس کھانے کو دیکھ کر تلملا اٹھیں گے۔ ان سے کہا جائے گا کہ تم مجرم ہو کر سوسائٹی میں بڑے شریف اور معزز بنتے تھے۔ اب تمہیں یہ ذلت کی روٹی کھانی ہو گی (ذُقْ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْكَرِيْمُ ۔ ۴۴/۴۹-۵۰)۔ وہ عذاب اور یہ روٹی چند دنوں میں ان کا حلیہ بگاڑ کر رکھ دے گی (لَوَّاحَةٌ لِّلْبَشَرِ ۔ ۷۴/۲۹)۔ وہ ساری چربی پگھلا کر رکھ دے گی جو مفت کی کھا کھا کر چڑھائی

گئی تھی (لَا تُبْقِي وَلَا تَذَرُ ۷۴/۲۸)۔ غرضیکہ حالت وہاں یہ ہوگی کہ ان کا شمار نہ مردوں میں ہوگا نہ زندوں میں (لَا يَمُوتُ فِيهَا وَلَا يَحْيَىٰ ۸۷/۱۳)۔ انہیں ہر طرف سے موت آتی دکھائی دے گی لیکن اس سے ان کی جان نہیں نکلے گی (وَيَأْتِيهِ الْمَوْتُ مِن كُلِّ مَكَانٍ وَمَا هُوَ بِمَيِّتٍ ۱۴/۱۷)۔ یہ ناک سے لکیریں نکالیں گے کہ ہمیں اس عذاب سے کسی طرح چھٹکارا مل جائے تو اس کے بعد ہم کبھی وہ کچھ نہیں کریں گے جس کی پاداش میں ہمیں یہ سزا ملی ہے۔ لیکن ان کی یہ معذرت قبول نہیں کی جائے گی۔ (رَبَّنَا أَخْرِجْنَا نَعْمَلْ صَالِحًا غَيْرَ الَّذِي كُنَّا نَعْمَلُ ۳۵/۳۷)۔ جہنم سے چھٹکارا ملنا تو ایک طرف، اس کے عذاب میں تخفیف تک نہیں کی جائے گی۔ (وَلَا يُخَفَّفُ عَنْهُم مِّنْ عَذَابِهَا ۳۵/۳۶)۔ ان سے کہہ دیا جائے گا کہ جنہوں نے غریبوں پہ اس قدر ظلم ڈھائے ہوں، ان کا کوئی حامی و ناصر نہیں ہو سکتا۔ (فَمَا لِلظَّالِمِينَ مِن نَّصِيرٍ ۳۵/۳۷)۔

اکیلے اکیلے مجرموں کے بعد پھر جتھوں، گروہوں اور پارٹیوں کی باری آئے گی۔ یہ گروہ اور پارٹیاں، ان تمام جرائم میں ایک دوسرے کی ہمراز اور دمساز تھیں۔ لیکن اب ان کی یہ کیفیت ہوگی کہ جب کوئی ایک پارٹی جہنم میں داخل ہوگی وہ دوسری پارٹی پر لعنت بھیجے گی (كُلَّمَا دَخَلَتْ أُمَّةٌ لَّعَنَتْ أُخْتَهَا ۷/۳۸)۔

وہاں سب پارٹیاں اکٹھی ہو جائیں گی۔ ان میں ان کے سرغنے (RING LEADERS) بھی ہوں گے اور لیڈروں کے پیچھے چلنے والے، ان کے ایجنٹ، گماشتے اور کارندے بھی۔ یہ پیچھے چلنے والے کہیں گے کہ ہمیں ان لیڈروں نے دھوکا دیا۔ اس لئے انہیں دوہری سزا ملنی چاہیئے (قَالُوا رَبَّنَا إِنَّا أَطَعْنَا سَادَتَنَا وَكُبَرَاءَنَا فَأَضَلُّونَا السَّبِيلَا ۔ رَبَّنَا آتِهِمْ ضِعْفَيْنِ مِنَ الْعَذَابِ وَالْعَنْهُمْ لَعْنًا كَبِيرًا ۔ ۳۳/۶۷-۶۸)۔ یہ لیڈر اپنے متبعین سے کہیں گے کہ کیوں باتیں بناتے ہو؟ کیا تمہیں معلوم نہیں تھا کہ قانون کا تقاضا کیا ہے اور اس کی خلاف ورزی کے نتائج کیا ہوا کرتے ہیں؟ اگر تمہارے دل میں قانون شکنی اور مفاد پرستی کا جذبہ نہ ہوتا تو ہم تمہیں ان جرائم پہ کیسے آمادہ کر سکتے تھے؟ اس لئے اس میں ہمارا کیا قصور؟ تم خود مجرم تھے اور مجرم ہو۔ (قَالَ الَّذِينَ اسْتَكْبَرُوا لِلَّذِينَ اسْتُضْعِفُوا أَنَحْنُ صَدَدْنَاكُمْ عَنِ الْهُدَىٰ بَعْدَ إِذْ جَاءَكُم ۖ بَلْ كُنتُم مُّجْرِمِينَ ۳۴/۳۲)۔ ان کے متبعین ان سے کہیں گے کہ یہ ٹھیک ہے کہ ہم ارتکابِ جرم میں تمہارے ساتھ برابر کے شریک تھے۔ بلکہ بالفاظ صحیح، تمہارے آلۂ کار تھے۔ لیکن یہ بتاؤ کہ تم جس قسم کے مکر و فریب کے جال دن رات بنتے رہتے تھے، جس قسم کی تدبیریں صبح شام سوچتے رہتے تھے جس قسم کی سازشوں میں مصروفِ تگ و تاز رہتے تھے، ہم جیسوں کے بس کی بات تھی کہ ان میں پھنس نہ جاتے یا تمہاری سازشوں میں شریک ہونے سے انکار کر دیتے؟ ہماری کیا مجال تھی کہ تم کسی بات کا حکم دیتے اور ہم اس سے انکار کر دیتے؟ (وَقَالَ الَّذِينَ اسْتُضْعِفُوا لِلَّذِينَ اسْتَكْبَرُوا بَلْ مَكْرُ اللَّيْلِ وَالنَّهَارِ إِذْ تَأْمُرُونَنَا أَن نَّكْفُرَ بِاللَّهِ وَنَجْعَلَ لَهُ أَندَادًا ۳۴/۳۳)۔ غرضیکہ اس میں بڑے جھگڑے ہوں گے۔ آخر الامر، ان لیڈروں کے متبعین ان سے کہیں گے کہ چھوڑو اور سب باتوں کو۔ اب کچھ ایسی تدبیر کرو جس سے اس سزا میں کچھ کمی ہو جائے ورنہ ہم تو یہیں ختم ہو جائیں گے (فَيَقُولُ الضُّعَفَاءُ لِلَّذِينَ اسْتَكْبَرُوا إِنَّا كُنَّا لَكُمْ تَبَعًا فَهَلْ أَنتُم مُّغْنُونَ عَنَّا نَصِيبًا مِّنَ النَّارِ ۴۰/۴۷)۔ وہ لیڈر کہیں گے کہ ہم خود تمہارے ساتھ پھنسے ہوئے ہیں۔ اس لئے ہم تمہارے لئے کیا کر سکتے ہیں۔ یہاں لیڈر اور عامی میں کوئی فرق نہیں۔ اب کوئی کسی کے لئے کچھ

نہیں کرسکتا (وَقَالَ الَّذِیْنَ اسْتَکْبَرُوْٓا اِنَّا کُلٌّ فِیْهَآ ... ۱۴/۲۱) اب چیخنے چلانے سے کچھ حاصل نہیں۔ اب تو اس عذاب کو جھیلنا ہی پڑے گا۔ اب گریز کی کوئی راہ نہیں (سَوَآءٌ عَلَیْنَآ اَجَزِعْنَآ اَمْ صَبَرْنَا مَا لَنَا مِنْ مَّحِیْصٍ ۱۴/۲۱)۔ اس وقت تمہارے مقابلہ میں ہماری پوزیشن اس لئے بڑی تھی کہ ہمارے پاس دولت زیادہ تھی اور قوت ہمارے ہاتھ میں تھی۔ لیکن تمہیں معلوم ہے کہ نہ تو ہمارا مال و دولت کسی کام آسکا ہے اور نہ ہی ہمارا وہ غلبہ اور اقتدار باقی رہا ہے (مَآ اَغْنٰی عَنِّیْ مَالِیَهْ ۚ هَلَكَ عَنِّیْ سُلْطٰنِیَهْ ۶۹/۲۸-۲۹) جب انقلاب میں اونچے اونچے محلوں والے سر کے بل نیچے گرتے ہیں تو ان کا جمع کردہ مال ان کے کسی کام نہیں آتا (وَمَا یُغْنِیْ عَنْهُ مَالُهٗٓ اِذَا تَرَدّٰی ۹۲/۱۱)۔

یہ حالت ہوگی ان کی جو گرفتار ہونے کے بعد اپنے کئے کی سزا بھگت رہے ہوں گے۔ جن کی باری ابھی آنے والی ہوگی وہ انہیں دیکھ کر کانپ رہے ہوں گے۔ وہ سزار چاہیں گے کہ کہیں بھاگ کر چلے جائیں لیکن اس سے بچ کر جانے کی کوئی جگہ نہیں ہوگی (وَرَاَ الْمُجْرِمُوْنَ النَّارَ فَظَنُّوْٓا اَنَّهُمْ مُّوَاقِعُوْهَا وَلَمْ یَجِدُوْا عَنْهَا مَصْرِفًا ۱۸/۵۳) ان سے کہا جائے گا کہ تمہیں چند دنوں کی مہلت دی جاتی ہے۔ اس مدت کے اندر اپنے جرائم کا اقبال کرو اور اس طرح خود ہی الگ نکل کر کھڑے ہو جاؤ (وَامْتَازُوا الْیَوْمَ اَیُّهَا الْمُجْرِمُوْنَ ۳۶/۵۹)۔ اگر تم نے ایسا نہ کیا تو پھر ایک ہانکنے والے اور ایک نگرانی کرنے والے کے "جلو" میں تم بھی وہیں پہنچا دیئے جاؤ گے جہاں دوسرے مجرم پہنچ چکے ہیں (وَجَآءَتْ كُلُّ نَفْسٍ مَّعَهَا سَآئِقٌ وَّشَهِیْدٌ ۵۰/۲۱)۔ یاد رکھو۔ ہم جو کچھ کہتے ہیں وہ ہو کر رہے گا۔ اب وہ وقت نہیں کہ قانون کی پکار ایک خالی دھمکی بن کر رہ جایا کرتی تھی۔ اب ہر تنبیہہ (WARNING) حقیقت ثابتہ بن کر سامنے آجائے گی۔ لیکن یہ کچھ دھاندلی سے نہیں ہوگا عین حق و انصاف کے مطابق ہوگا۔ (مَا یُبَدَّلُ الْقَوْلُ لَدَیَّ وَمَآ اَنَا بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِیْدِ ۵۰/۲۹) تمہیں تمہارے کئے کی سزا ملے گی (اِنَّمَا تُجْزَوْنَ مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ۶۶/۷)۔

باقی رہے شریف آدمی سو ان کے لئے ڈرنے اور گھبرانے کی کوئی بات نہیں (لَا خَوْفٌ عَلَیْهِمْ وَلَا هُمْ یَحْزَنُوْنَ ۲/۳۸)۔

قرآنی قوانین

للہ الحمد کہ پرویز صاحب کی تازہ ترین تصنیف ——— قرآنی قوانین ——— ملک میں بے حد مقبول ہو رہی ہے اور اس کی افادیت نکھر کر سامنے آرہی ہے۔ اس سے نظر آتا ہے کہ اس کا پہلا ایڈیشن جلد ختم ہو جائے گا۔ اگر آپ نے اسے ابھی تک حاصل نہیں کیا تو جلدی منگوا لیجئے۔

قیمت فی جلد (مجلد) بیس ۲۰/- روپے (علاوہ محصول ڈاک)

ملنے کا پتہ ★

پاکستان کے "ہمدرد اور غمگسار"

گزشتہ مارچ۔ اپریل میں بھارت کے ایک ممتاز راہنما (بھارتی لوک سبھا میں جنتا پارٹی کے رکن اور پارٹی کی نوجوان پارٹی کے صدر) ڈاکٹر سبرامنیم سوامی نے پاکستان کا دورہ کیا اور اپنے متعلق یہ تاثر دیا گویا وہ پاکستان کی سالمیت اور تحفظ کے غم میں نڈھال ہوئے ہیں۔ انہوں نے صدرِ مملکتِ پاکستان جنرل ضیاء الحق سے بھی ملاقات کی تھی۔ انہوں نے لاہور کے سٹیٹ گیسٹ ہاؤس میں نمائندہ نوائے وقت کے ساتھ ایک انٹرویو کے دوران اپنی اس تجویز کا ذکر کیا کہ پاکستان کو "پہاڑی ڈویژن" تیار کرنا چاہیے۔ اس تجویز کی اہمیت کے سلسلہ میں انہوں نے کہا:-

> آپ کا شمال مغربی صوبہ پہاڑی علاقہ پر مشتمل ہے۔ اگر شمال مغرب کی طرف سے کوئی ملک پاکستان کے خلاف جارحیت کا ارتکاب کرے تو لازمی طور پر وہ درۂ خیبر یا دوسرے معروف دروں سے گزر کر آئے گا۔ اس سے قبل آپ کو اس طرف سے جارحیت کا خطرہ نہیں تھا مگر میری نظر میں یہ خطرہ اب موجود ہے اور آپ کو اس حملہ کو روکنے کے لئے پہاڑی ڈویژنوں کی ضرورت ہے۔ (نوائے وقت ۲۳ مارچ ۱۹۸۰ء)

آپ نے غور فرمایا کہ سوامی صاحب کو پاکستان کے تحفظ کا غم کس طرح کھائے جا رہا ہے؟ انہوں نے ۱۴ اپریل کو کراچی میں ایک انٹرویو کے دوران کہا:-

> اگر پاکستان کو اسلحہ کی مدد مل سکتی ہے تو میرے نزدیک اس سے بھارت کو کوئی تشویش نہیں ہونی چاہیئے۔ میں سمجھتا ہوں کہ مسز اندرا گاندھی اس سلسلہ میں امریکہ سے جو احتجاج کر رہی ہیں وہ غلط ہے۔ (پاکستان کے اٹمی پروگرام کے سلسلہ میں بھی انہوں نے کہا کہ) یہ امر بھی میرے نزدیک کسی کے لئے تشویش کا باعث نہیں ہونا چاہیئے۔ (دی مسلم۔ راولپنڈی۔ ۱۵ اپریل ۱۹۸۰ء)

مسٹر سوامی اس قسم کے تاثرات دینے کے لئے پاکستان آئے اور یہ "فریضہ" ادا کرنے کے بعد واپس تشریف لے گئے۔ لیکن (جہاں تک ہمارے علم میں ہے) یہاں کسی نے ان کا تعارف نہ کرایا کہ یہ پاکستان کے نامی مشفق کون بزرگوار ہیں۔ ان کا ماضی کیا ہے۔ پاکستان کو ختم کرنے کے لئے یہ کس قسم کی اسکیمیں مرتب کرتے اور انہیں کامیاب بناتے رہے ہیں۔

یہ صاحب اندرا حکومت کے دورِ اول میں، حکومت کی دفاعی ٹیکنالوجی کے مشیر تھے اور (منجملہ دیگر امور) وہاں کا "اٹمی دھماکہ" انہی کے ذہن کی اختراع تھی۔ چنانچہ جب ۱۹۷۴ء میں وہاں یہ دھماکہ کیا گیا تو یہ اپنی اس کامیابی پر پھولے نہیں سمائے، اور عجلہ آرگنائزر (دہلی) کے ۱۳ جولائی ۱۹۷۴ء کے شمارہ میں انہوں نے ایک مقالہ شائع کیا جس کی ابتداء ان الفاظ سے کی:-

> کئی سال پہلے کی بات ہے کہ کچھ لوگ مجھے "بم سوامی" کے نام سے پکارتے اور مذاق اڑاتے تھے لیکن آج جب یہ بم پھٹ چکا ہے، مجھے ایک حد تک ان لوگوں سے نفرت سی محسوس ہو رہی ہے۔

طلوعِ اسلام نے اس زمانہ میں اس کا نوٹس لیا اور نومبر ۱۹۷۴ء کے شمارہ میں اس پر سیر حاصل تبصرہ کیا۔ اس کے بعد جب ۱۹۷۸ء میں انڈیا کی طرف سے پھر خطرہ محسوس ہوا تو ہم نے مارچ ۱۹۷۸ء کے شمارہ میں پاکستان کے

خلاف ہندوؤں کے عزائم کا قدرے تفصیل کے ساتھ جائزہ لیتے ہوئے، ضمناً "ہم سوامی" کا بھی تذکرہ کیا۔ چونکہ وہ تجزیہ بڑی اہم معلومات کا حامل ہے اس لئے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اسے پورے کا پورا یہاں درج کر دیا جائے۔ اس میں ہم نے لکھا تھا:-

ہندو نہ کسی فرد کا نام ہے۔ نہ کسی فرقہ کا اور نہ کسی قوم کا۔ یہ ایک ذہنیت ہے جو تنگ نظری، انتقام جوئی، مفاد پرستی سے ترتیب پاتی اور نفرت، عداوت، فریب دہی اور روباہ بازی کے جذبات پر پروان چڑھتی ہے۔ ہندوؤں کی ساری تاریخ میں صرف ایک سیاسی فلاسفر پیدا ہوا ہے۔ نام تو اس کا چانکیہ تھا لیکن وہ اپنے آپ کو نہایت فخر سے کوٹلیا کہتا تھا، اور ہندو بھی اسے اسی لقب سے پکارتے ہیں۔ کوٹلیا کے معنی ہیں مکار اور فریب کار۔ اس سے آپ اندازہ لگا لیجئے کہ جو گروہ اس ذہنیت کا مالک ہو اس کے چیلے کن خصوصیات کے حامل ہوں گے۔ اس نے اصولِ سیاست پر "ارتھ شاستر" کے نام سے ایک کتاب لکھی تھی۔ یہ کتاب سنسکرت میں تھی لیکن چند سال اُدھر، اس کا انگریزی ترجمہ شائع ہوا تھا۔ اس میں کوٹلیا صاحب نے جو اصولِ سیاست درج فرمائے ہیں، ان میں سے چند ایک ملاحظہ فرمائیے۔

پہلا اصول:- حصولِ اقتدار اور ملک گیری کی ہوس کبھی ٹھنڈی نہ ہونے پائے۔

دوسرا اصول:- ہمسایہ سلطنتوں سے وہی سلوک روا رکھا جائے جو دشمنوں سے رکھا جاتا ہے۔ تمام ہمسایوں پر کڑی نگرانی رکھی جائے۔

تیسرا اصول:- غیر ہمسایہ سلطنتوں سے دوستانہ تعلقات قائم کئے جائیں۔

چوتھا اصول:- جن سے دوستی رکھی جائے، اس میں بھی ہمیشہ اپنی اغراض پیشِ نظر رہیں اور مکارانہ سیاست کا دامن کبھی ہاتھ سے نہ چھوڑا جائے۔

پانچواں اصول:- دل میں رقابت کی آگ مشتعل رکھی جائے۔ ہر بہانہ سے جنگ کی چنگاریاں سلگائی جاتی رہیں۔ جنگ میں انتہائی تشدد سے کام لیا جائے۔ حتیٰ کہ خود اپنے شہریوں کے مصائب و آلام کی بھی پرواہ نہ کی جائے۔

چھٹا اصول:- دوسرے ملکوں میں مخالفانہ پروپیگنڈہ، تخریبی کاروائیاں اور ذہنی انتشار پیدا کرنے کی مہم جاری رکھی جائے۔ وہاں اپنے آدمی ناجائز طریق سے داخل کر کے، ففتھ کالم بنایا جائے اور یہ سب کچھ بالالتزام کیا جائے۔

ساتواں اصول:- رشوت اور دیگر اسی قسم کے ذرائع سے اقتصادی جنگ جاری رکھی جائے اور دوسرے ملکوں کے آدمیوں کو خریدنے کی کوشش کی جائے۔

آٹھواں اصول:- امن کے قیام کا خیال تک بھی دل میں نہ لایا جائے خواہ ساری دنیا اس پر مجبور کرے۔

یہ ہیں مختصر الفاظ میں سیاست کے وہ اصول جو اس قوم کے ایک "مہاتما" نے انہیں دیئے تھے۔ مہاتما اُن کے ست جگ کے زمانے کی پیداوار تھے۔ یعنی وہ زمانہ جس میں، ہندوؤں کے عقیدہ کے مطابق، سچائی کا دور دورہ تھا۔ اس کے بعد کلجگ میں ایک اور مہاتما پیدا ہوئے جنہیں گاندھی جی کہا جاتا، اور سچائی کا مجسمہ اور اہسا (عدمِ تشدد) کا اوتار کہہ کر پکارا جاتا ہے۔ ان مہاتما جی کی ذہنیت کس قسم کی تھی اس کے متعلق قائداعظمؒ کی زبان سے سنئے جنہیں ان کے ساتھ دن رات واسطہ پڑتا تھا۔ انہوں نے مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن (جالندھر) کے اجلاس منعقدہ ۱۹۴۲ء میں، پبلک پلیٹ فارم سے کہا تھا:-

مشکل یہ ہے کہ گاندھی جی کا حقیقی مقصد وہ نہیں ہوتا جو وہ زبان سے کہتے ہیں اور جو کچھ ان کے دل میں ہوتا ہے، اسے کبھی زبان پہ نہیں لاتے۔

اسی طرح انہوں نے اگست ۱۹۴۵ء میں ایک جلسہ میں تقریر کرتے ہوئے کہا تھا:۔

> ہمیں جس حریف سے پالا پڑا ہے وہ گرگٹ کی طرح اپنا رنگ بدلتا رہتا ہے۔ جب ان کے (یعنی مہاتما گاندھی کے) مفید مطلب ہوتا ہے وہ کہہ دیتے ہیں کہ وہ کسی کے نمائندہ نہیں۔ وہ محض انفرادی حیثیت سے گفتگو کر رہے ہیں۔ وہ کانگریس کے چار آنہ کے ممبر بھی نہیں، اور جب ضرورت ہوتی ہے تو سارے ہندوستان کے واحد نمائندہ بن جاتے ہیں۔ جب اور حربوں سے کام نہیں چلتا تو مرن برت رکھ لیتے ہیں۔ جب کوئی دلیل بن نہیں پڑتی تو "اندرونی آواز" کو بلا لیتے ہیں۔ کہیئے کہ ایسے شخص سے کوئی کس طرح بات کر سکے! وہ تو ایک چیستان ہیں معمہ ہیں!!

یہ ذہنیت کسی کی انفرادی افتادِ طبیعت کا نتیجہ نہیں، یہ ہندو دھرم کی پیدا کردہ ہے۔ مسٹر سری پرکاش، پاکستان میں بھارت کے پہلے ہائی کمشنر تھے۔ انہوں نے ۱۳ر نومبر ۱۹۴۸ء کو تھیاسوفیکل ہال کراچی میں ایک تقریر کی تھی جس کا عنوان تھا "ہندو مت، ایک ضابطۂ اخلاق کی حیثیت سے"۔ اس تقریر میں انہوں نے واضح الفاظ میں کہا تھا کہ جو شخص سمجھتا ہے کہ ہندو مت کوئی مستقل ضابطۂ اخلاق پیش کرتا ہے جس پر سوسائٹی کی بنیاد رکھی جا سکے، وہ بہت بڑی غلط فہمی میں مبتلا ہے۔

> کسی کو یہ بات پسند آئے یا نہ آئے، یہ حقیقت ہے جس کا کھلے بندوں اعتراف کرنا چاہیئے کہ ہندو مت میں کوئی قطعی، غیر متبدل اصولِ زندگی نہیں۔ ہر مصلحت کے لئے اس کا الگ اصول ہے۔ ہندو مت ایک عملی مذہب ہے۔ وہ جانتا ہے کہ ہر موقعہ پر دیانت اور سچائی سے کام نہیں چل سکتا اس لئے وہ کبھی ایسی تعلیم نہیں دیتا جو ناممکن العمل ہو۔ یہی وہ راز ہے جس کی بنا پر ہندو مت ہزاروں سال سے مختلف حالات اور متبائن احوال میں زندہ رہا اور زندہ رہے گا۔
>
> (طلوعِ اسلام - دسمبر ۱۹۴۸ء)

ہزارہا سال تک زندہ رہنے کے بعد، جب اس قوم کو ہندوستان سے انگریز کے چلے جانے کے آثار دکھائی دینے لگے تو اس نے محض "زندہ رہنے" کی خواہش تک انحصار نہ کیا۔ اس نے فیصلہ کیا کہ انگریزوں کے چلے جانے کے بعد، اپنی صدیوں کی غلامی کا انتقام مسلمانوں سے لیا جائے۔ اس قوم کے "مردِ آہن" سردار پٹیل کی اسکیم تھی کہ مسلمانوں کو پھر سے ہندو بنا لیا جائے۔ چنانچہ انہوں نے مارچ ۱۹۴۲ء میں، احمد آباد میں ایک تقریر کے دوران کہا کہ:۔

> جو لوگ جداگانہ قومیت کے متمنی ہیں ان میں سے نوے فی صدوہ ہیں جو اس ملک کی مٹی کی پیداوار ہیں۔ اس لئے اگر یہ لوگ پھر اپنی اصل میں جذب نہیں کئے جا سکتے تو یہ ان لوگوں کا قصور ہے جن سے نکل کر یہ لوگ الگ ہوئے تھے۔
>
> (طلوعِ اسلام - اپریل ۱۹۴۲ء)

جو لوگ سردار پٹیل کی اس اسکیم کو ممکن العمل نہیں سمجھتے تھے ان کے عزائم یہ تھے کہ انگریزوں کے چلے جانے کے بعد ملک میں جمہوری نظامِ حکومت رائج کیا جائے اور اس طرح اپنی ناقابلِ تغیر عددی اکثریت (IN-CONVERTIBLE MAJORITY) کی بنا پر مسلمان اقلیت کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اپنا محکوم رکھا جائے۔

یہ تھے اس قوم کے عزائم جنہیں ملتِ اسلامیہ کے مردِ مجاہد قائداعظمؒ نے دس سال کی مسلسل جنگ کے بعد، خاک میں ملا دیا اور ہندو کو ملک کی تقسیم کو تسلیم کرنا پڑا۔ کوئی دیانتدار قوم ہوتی تو تقسیم ہند کے اس فیصلے کو (خواہ وہ اس کی مرضی کے خلاف ہی ہوا تھا) کشادہ دلی سے قبول کرتی، لیکن ہندو ذہنیت سے اس قسم کی توقع رکھنا عبث تھا۔ پاکستان، کانگریس اور مسلم لیگ کے باہمی سمجھوتے سے وجود میں آیا تھا۔ اس سمجھوتے کا اعلان ۳ر جون ۱۹۴۷ء کو ہوا تھا، اور ۱۶ر جون کو اسی کانگریس کی آل انڈیا کمیٹی نے حسب ذیل ریزولیوشن پاس کیا تھا:۔

آل انڈیا کانگریس کمیٹی کو پورا پورا یقین ہے کہ جب موجودہ جذبات کی شدت میں کمی آجائے گی تو ہندوستان کے مسئلہ کا حل صحیح صحیح پس منظر میں دریافت کر لیا جائے گا اور ہندوؤں اور مسلمانوں کے دو الگ الگ قومیں ہونے کا باطل نظریہ مردود قرار پا جائے گا۔

کانگریس کی طرف سے "تقسیم ہند کے فیصلے پر دستخط پنڈت جواہر لال نہرو نے کئے تھے۔ وہ ایک طرف اس دستاویز پر دستخط کر رہے تھے اور دوسری طرف اپنی قوم سے کہہ رہے تھے کہ:-

ہماری اسکیم یہ ہے کہ ہم اس وقت جناح کو پاکستان بنا لینے دیں اور اس کے بعد معاشی طور پر یا دیگر انداز سے ایسے حالات پیدا کرتے جائیں جن سے مجبور ہو کر مسلمان گھٹنوں کے بل جھک کر ہم سے درخواست کریں کہ ہمیں پھر سے ہندوستان میں مدغم کر لیجئے۔

کانگریس سے باہر دیوان چمن لال جیسا (بظاہر) اعتدال پسند لیڈر یہ کہہ کر ہندوؤں کی ڈھارس بندھا رہا تھا کہ:-

میں ناامید ہونے والوں میں نہیں ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ تقسیم ہند ایک عارضی سا حادثہ ہے۔ اس کے باوجود ہم تیس کروڑ ہندوؤں کو اس مقصد کے حصول کے لئے جان تک دیدینے کے لئے تیار رہنا چاہیئے۔ یہ بہت غلط ہوگا کہ ہم اپنی قوم کو امن اور شانتی کی لوریاں دے دے کر اسی طرح سلائے رکھیں جس طرح ہم نے انہیں اس وقت تک سلائے رکھا ہے اور جس کا نتیجہ اب ہمارے سامنے ہے۔ ہم میں بنیادی نقص یہ ہے کہ ہم ضرورت سے زیادہ امن پسند واقعہ ہوئے ہیں۔ (آرگنائزر - ۳ جولائی ۱۹۴۷ء)

دوسری طرف ڈاکٹر شیاما پرشاد مکرجی، اپنی قوم کو یہ ویاکھیان (وعظ) سنا رہے تھے کہ:-

ہمارا نصب العین یہ ہونا چاہیئے کہ پاکستان کو پھر سے ہندوستان کا حصہ بنا لیا جائے۔ اس حقیقت کے متعلق میرے دل میں ذرا سا بھی شبہ نہیں کہ ایسا ہو کر رہے گا خواہ یہ معاشی دباؤ سے ہو یا سیاسی دباؤ سے یا اس کیلئے دیگر ذرائع استعمال کرنے پڑیں۔ (ایضاً)

ہندو مہا سبھا کے صدر، مسٹر ساورکر نے اس سے بہت پہلے ایک اسکیم مرتب کی تھی جس کا انکشاف قائداعظمؒ نے دسمبر ۱۹۴۱ء میں ان الفاظ میں کیا تھا:-

ساورکر کی اسکیم یہ ہے کہ جب (انگریز کے جانے کے بعد) میدانی، بحری اور فضائی فوج میں ہندوؤں کو ۷۵ فیصد حصہ مل جائیگا تو پھر ہندو راج قائم کرنے کی کوشش کی جائیگی۔ ان مسلمانوں کا کیا حشر ہوگا جو شمال مغرب اور شمال مشرق میں بستے ہیں؟ ان کے متعلق وہ کہتے ہیں کہ سرحدوں پر ہندو فوج اس طرح بٹھا دی جائیگی جس طرح اب برطانوی فوج متعین ہے۔ یہ فوج اس کا خیال رکھے گی کہ مسلمان سر نہ اٹھا سکیں۔

(آل انڈیا مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن کے اجلاس میں تقریر)

ؔ اس مقام پر مناسب معلوم ہوتا ہے کہ مسلم ذہنیت کی ایک مثال بھی سامنے لائی جائے۔ تقسیم ہند کا اصولی فیصلہ ہو جانے کے بعد ایک باؤنڈری کمیشن مقرر ہوا کہ وہ پاکستان اور ہندوستان کی حدود کا تعین کرے۔ لارڈ ریڈکلف اس کمیشن کے سربراہ تھے۔ اس شخص نے انتہائی بددیانتی اور دیدہ دلیری سے پاکستان کے نہایت اہم حصے ہندوستان کی طرف منتقل کر دیئے۔ اس پر مسلمانوں میں سخت ہیجان پیدا ہوا اور انہوں نے مطالبہ کیا کہ اس فیصلہ کو مسترد کر دیا جائے۔ لیکن قائداعظمؒ نے اس احتجاج کے جواب میں جو کچھ فرمایا وہ مسلم ذہنیت کا صحیح صحیح آئینہ دار ہے۔ انہوں نے فرمایا:-

بلاشبہ تقسیم کے سلسلہ میں ہمارے ساتھ سخت ناانصافیاں روا رکھی گئی ہیں اور اس عظیم مملکت کی سرحدوں کو ہر ممکن حربے سے سکیڑ دیا گیا ہے۔ ریڈ کلف کا ایوارڈ ہمارے جسم پر آخری [illegible] ہے۔ یہ غیر عادلانہ، غیر منصفانہ اور ناقابل فہم فیصلہ، کج فہمی اور کج روی کا منحوس پیکر ہے۔ لیکن یہ کتنا ہی غلط اور بے جواز کیوں نہ ہو۔ ہم اسے قبول کرنے کا عہد کر چکے ہیں اور ہم اس عہد کے پابند ہیں۔ ہم ایک باعزت قوم کی طرح امید کے چراغ جلا کر عزم و استقامت اور ہمت و جرأت سے مصائب برداشت کرنے کی توفیق رکھتے ہیں۔ خدا نے چاہا تو ان صدمات کے باوجود ہم اس آگ سے کندن بن کر نکلیں گے۔

"ہم اسے قبول کرنے کا عہد کر چکے ہیں اور ہم اس عہد کے پابند ہیں" ــــــ یہ ہے مسلم ذہنیت۔

سوشلسٹوں کے متعلق عام طور پر یہ خیال کیا جاتا ہے کہ ان میں مذہبی تعصب نہیں ہوتا کیونکہ وہ سیکولر ذہنیت رکھتے ہیں۔ لیکن جہاں تک مسلمانوں کے خلاف جذباتِ عداوت کا تعلق ہے، ہندوؤں کے سوشلسٹ طبقہ اور مہاسبھا میں کوئی فرق نہیں تھا۔ ہندوستان کی سوشلسٹ پارٹی کے لیڈر ڈاکٹر رام منوہر لوہیا نے اپنی کتاب "اگلا قدم" میں لکھا تھا۔

> ہم زیادہ عرصہ تک انتظار نہیں کر سکتے۔ شاید دو تین سال کے عرصہ میں امرتسر اور پاکستان کی درمیانی حدِ فاصل مٹ جائے گی۔ ہمیں پاکستان کے اس زہر کو ختم کر کے تقسیمِ ہند کو کالعدم کر دینا چاہیئے۔ مجھے یقین ہے کہ یہ مصنوعی تقسیم ختم ہو جائے گی اور پاکستان اور ہندوستان پھر سے ایک ملک ہو جائیں گے۔

اس دو تین سال کے عرصہ میں پاکستان کو ختم کرنے کے لئے "کیا کیا عملی تدابیر اختیار کی گئیں" انکی تو تفصیل طول طویل ہے۔ ان کی ایک آدھ مثال ملاحظہ فرمایئے۔ تقسیم کے معاہدہ کی رو سے، ایک لاکھ پینسٹھ ہزار ٹن فوجی سامان پاکستان کے حصے میں آیا تھا۔ اس میں سے ہندوستان نے، ۳۱ مارچ سنہ ۱۹۴۸ء تک، صرف (۴۷۰۳) ٹن سامان پاکستان کو دیا۔ باقی دبا بیٹھا۔ جہاں تک نقد روپے کا تعلق ہے، پاکستان کے حصہ میں ایک ارب روپیہ آتا تھا۔ ہندوستان نے اس رقم کی ادائیگی سے بھی انکار کر دیا۔ اور دسمبر سنہ ۱۹۴۷ء میں بصد مشکل اس پر رضامند ہوا کہ پاکستان کو (۷۵) کروڑ روپیہ دیا جائے۔ اس میں سے بیس کروڑ روپیہ پاکستان مل چکا تھا۔ ہندوستان بقایا (۵۵) کروڑ روپیہ دبا کر بیٹھ گیا۔ جب بین الاقوامی دباؤ کے تحت ہندوستان کو یہ روپیہ ادا کرنا پڑا تو اس میں سے پانچ کروڑ کی ڈنڈی مار گیا۔ (اس کے برعکس ہندوستان کے حصے کے نوے ہوائی جہاز پاکستان میں پڑے تھے۔ پاکستان نے نوے کے نوے بحفاظت ہندوستان کے حوالے کر دیئے)۔ یہ کچھ تو ہند کی طرف سے حکومتی سطح پر ہو رہا تھا۔ انفرادی طور پر ہندو کیا کر رہا تھا، اس کا اندازہ ایک مثال سے لگایئے کہ حکومتِ ہند کے ایک اعلیٰ ہندو افسر نے پاکستان کے انجینئرنگ سٹور ڈپو میں متعین بعض انگریز افسروں سے سازباز کی جس کی رو سے پاکستان کی کروڑوں روپے مالیت کی مشینری خفیہ طور پر ہندوستان پہنچائی جا رہی تھی۔ (پاکستان ٹائمز ۲۸ جنوری سنہ ۱۹۴۸ء بحوالہ پاکستان ٹائمز۔ مورخہ ۲۸ جنوری سنہ ۱۹۴۸ء) وہ تو غنیمت ہوا کہ یہ سازش بروقت پکڑی گئی، اور یہ مشینری ہندوستان پہنچنے سے بچا لی گئی لیکن کیا معلوم کہ اس قسم اور کس قدر (کامیاب) سازشیں ہوئی تھیں۔ پاکستان کو فوجی اور مالی اعتبار سے اس طرح مفلوج بنا دینے کے بعد ہندو کے ارادے کیا تھے اس کا انکشاف وہاں کے سابق چیف جسٹس مسٹر مہاجن نے ان الفاظ میں کیا تھا کہ ہندوستان نے دسمبر سنہ ۱۹۴۷ء میں فیصلہ کر لیا تھا کہ پاکستان پر حملہ کر دیا جائے لیکن بعض داخلی مصالح کے پیشِ نظر اس فیصلہ پر عمل درآمد نہ ہو سکا۔ اس کے تین سال بعد، راجہ مہندر پرتاپ نے اپنی قوم کو مشورہ دیا تھا کہ:۔

> جب تک پاکستان کا وجود ختم نہیں ہو جاتا ہمارا ملک کوئی ترقی نہیں کر سکتا۔ حالات اس طرح بدل رہے ہیں کہ مجھے یقین ہوتا چلا جا رہا ہے کہ ہندوستان اور پاکستان میں جنگ لابدی ہو گئی ہے۔ بنابریں میں حکومتِ ہند کو مشورہ دوں گا کہ وہ افغانستان کو اپنے ساتھ ملا کر پاکستان کو ختم کر دے۔ (ویر بھارت - ۲۱ دسمبر سنہ ۱۹۵۰ء)

چنانچہ جب سنہ ۱۹۵۰ء میں بنگال میں فسادات کرائے گئے تو اس کے ساتھ ہی وہاں پاکستان پر فوجی حملہ کرنے کی تحریک بھی چلائی گئی جس کی تائید پنڈت نہرو اور جے پرکاش نارائن جیسے چوٹی کے ہندو لیڈروں نے کی۔ ابتدائے سنہ ۱۹۶۵ء میں ہندوستان نے رن آف کچھ میں چھیڑ چھاڑ شروع کر دی تو وہاں کے ہوم منسٹر، مسٹر نندا نے لوک سبھا میں اعلان کیا کہ ہم نے پوری آٹھ لاکھ فوج کو تیاری کا حکم دے دیا ہے۔ اور وزیر اعظم نے یہ کہہ کر اس کی تائید کی کہ آج ہندوستان کی چوالیس کروڑ آبادی ہر قربانی کے لئے تیار بیٹھی ہے۔ ادھر رن آف کچھ میں یہ کچھ ہو رہا تھا اور ادھر انہوں نے مشرقی پاکستان میں پاکستانی علاقہ داہاگرام پر دھاندلی سے قبضہ کر لیا۔ ستمبر سنہ ۱۹۶۵ء میں وہ

جس طرح شب خون مار کر مغربی پاکستان کی سرحدوں پر چڑھ دوڑے تھے، اس کی تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں۔ جب پاکستان کے جیالے مجاہدوں نے ان کے ان مذموم عزائم کو خاک میں ملا دیا تو وہاں کے وزیرِ دفاع مسٹر چوہان نے اپنے ایک بیان میں کہا تھا کہ :-

> پاکستان اور ہندوستان کے درمیان اسی دن سے مخاصمت کی بنیاد رکھ دی گئی تھی جس دن پاکستان معرضِ وجود میں آیا تھا۔ پاکستان اور بھارت میں آئیڈیالوجی کا اختلاف ہے۔ اس کے سوا کوئی اختلاف نہیں۔ اور یہ اختلاف اور دشمنی مہینے یا ہفتے بھر کی نہیں بلکہ سالہا سال تک رہے گی۔ بھارت کو اس کے لئے ایک تازہ اور فیصلہ کن جنگ کے لئے تیار رہنا چاہیئے۔
>
> (طلوعِ اسلام - فروری ۱۹۶۶ء)

اور اس فیصلہ کن جنگ کے لئے ہندو نے مشرقی پاکستان کا میدان تاکا۔ بھارتی پارلیمان کے ایک ممتاز ممبر مسٹر سبرامنیم سوامی، پاکستان کے خلاف جنگ کے سلسلہ میں کافی شہرت حاصل کر چکے ہیں۔ انہوں نے دہلی سے شائع ہونے والے مجلہ آرگنائزر کے ۳ جولائی ۱۹۷۲ء کے شمارہ میں ۱۹۷۱ء کی (مشرقی پاکستان کی) جنگ کے سلسلہ میں، ایک اہم مقالہ شائع کیا تھا۔ اس میں انہوں نے کہا تھا کہ :-

> ۱۹۷۱ء سے بھارتی حکومت کے زیادہ تر اور اہم فیصلے قوم پرست املا کرایا کرتے ہیں۔ پہلا فیصلہ پاکستان کو ٹکڑے ٹکڑے اور بنگلہ دیش قائم کرنے کا تھا۔ جن سنگھ نے اگست ۱۹۷۱ء میں زبردست عوامی مظاہروں سے ملک کو ہلا کر رکھ دیا۔ اور چونکہ ۱۹۷۲ء میں انتخابات ہونے والے تھے اس لئے اندرا گاندھی، کرسی سرکشا کے لئے اپنی پالیسی ترک کرنے اور جنگ چھیڑنے پر مجبور ہو گئیں ..... بھارت نے یہ جنگ محض قوم پرستوں کی تسلی اور نتیجۃً اس مقبول عام نظریہ کی تشفی کے لئے چھیڑی تھی کہ پاکستان کا ٹکڑے ہو جانا، بھارت کے طویل المیعاد دور رس مفاد میں ہے ..... بھارتی قوم پرست بچے کھچے پاکستان کے بھی درپے ہیں اور اسے ٹکڑے ٹکڑے کر دینے کی فکر میں ہیں کہ یہی اکھنڈ بھارت کا راستہ ہے۔

اس کے بعد مسٹر سبرامنیم نے لکھا تھا :-

> کسی بھارتی نے تقسیمِ ہند کو کبھی بھی تسلیم نہیں کیا۔ اور نہ کبھی کرے گا ..... پاکستان میں پہلے ہی دراڑیں پڑ چکی ہیں۔ وہ دن دور نہیں جب پختونستان، سندھو دیش اور بلوچستان کی تشکیل و قیام کے لئے دباؤ بڑھ جائیگا۔ ہم بھارتیوں کو نفسیاتی طور پر اس کیلئے تیار رہنا چاہیئے اور اس وقت اپنی فوجیں پاکستان میں داخل کر دینی چاہئیں کہ پختونستان، سندھو دیش اور بلوچستان کے سربراہ ہمارے متلاشی ہوں گے۔
>
> (بحوالہ طلوعِ اسلام - بابت نومبر ۱۹۷۲ء)

مسٹر سبرامنیم نے کہا ہے کہ "بھارتیوں کو پاکستان کو ختم کر دینے کے لئے نفسیاتی طور پر تیار رہنا چاہیئے"۔ انہیں اس مقصد کے لئے نفسیاتی طور پر کس طرح تیار کیا جا رہا ہے، یہ داستان بڑی دلچسپ بھی ہے اور عبرت آموز بھی۔ جہانتک ہمیں معلوم ہے، یہ اہلِ پاکستان کے سامنے اس سے پہلے نہیں آئی۔ اسے بڑی گہری توجہ سے سنئے۔

(جیسا کہ معلوم ہے) مہاتما گاندھی، ہندوؤں کے سیاسی لیڈر ہی نہیں تھے۔ وہ ان کی، اوتار کی حیثیت سے پرستش کرتے تھے۔ انہی مہاتما گاندھی کو جنوری ۱۹۴۸ء میں ایک ہندو نوجوان، نتھورام گوڈسے، نے اس وقت پستول کا نشانہ

ط ہندوستان کے وزیرِ خارجہ، مسٹر باجپائی جو حال ہی میں پاکستان کے دورہ پر آئے تھے، اسی جن سنگھ کے صدر تھے۔ بعد میں یہ صاحب پاکستان میں بھارت کے سفیر کی حیثیت سے آئے تھے۔

بنا کر قتل کر دیا تھا جب وہ اپنی شام کی پرارتھنا کے لئے آ رہے تھے۔ گوڈسے ایک تعلیم یافتہ نوجوان تھا جو ہندوؤں کی کٹر متعصب جماعت ہندو مہا سبھا (یا اس کے عسکری ذیلی اداروں۔ جن سنگھ یا راشٹریہ سیوک سنگھ) سے وابستہ تھا۔ اس سے پوچھا گیا کہ اس نے مہاتما گاندھی جیسے اہنسا (عدم تشدد) کے اوتار کو کس جرم کی پاداش میں قتل کیا ہے، تو اس نے کہا کہ مہاتما گاندھی کی اہنسا کی تعلیم نے قوم کو بزدل بنا دیا ہے جس کی وجہ سے وہ مسلمانوں اور پاکستان سے پورا پورا انتقام لینے کے قابل نہیں رہی۔ میں نے انہیں اسی جرم کی پاداش میں قتل کیا ہے۔

بمبئی سے شائع ہونے والے ہفتہ وار اخبار السٹریٹڈ ویکلی کی (۲۶-۲۰) نومبر ۱۹۷۷ء کی اشاعت میں گوڈسے کے چھوٹے بھائی، گوپال گوڈسے کے قلم سے ایک مضمون چھپا ہے جس میں اس نے اس دن (۱۵ نومبر ۱۹۴۹ء) کی روئداد درج کی ہے جب نتھورام اور اس کے ساتھی مجرم، نارائن آپٹے کو انبالہ جیل میں پھانسی دی گئی تھی۔ (گوپال گوڈسے بھی اسی جرم میں ملوث، عمر قید کی سزا بھگت رہا تھا) گوڈسے نے وصیت کی تھی کہ اس کی راکھ دریائے سندھ میں بہائی جائے۔ اس کے بھائی نے اس سے پوچھا کہ آپ ایسا کیوں چاہتے ہیں، تو اس نے جواب دیا:

> اس لئے کہ سندھ ہی ہندوستان کا مقدس دریا ہے لیکن بدقسمتی سے وہ آج ہندوستان کے اندر نہیں۔ مہاتما گاندھی کی راکھ دنیا کے متعدد دریاؤں میں بہائی گئی لیکن حکومت پاکستان نے، بھارتی حکومت کو اس کی اجازت نہ دی کہ وہ گاندھی جی کی راکھ کو دریائے سندھ میں بہائیں۔ پاکستان نے، بھارت کی ہتک کی ہے جس کا مجھے صدمہ ہے۔ ہماری حکومت کو چاہیئے تھا کہ گاندھی جی کی راکھ کا کچھ حصہ محفوظ رکھتی اور جب وہ پاکستان کو پھر سے ہندوستان کا حصہ بنا لیتی تو اس راکھ کو دریائے سندھ میں بہاتی۔ پاکستان کے انکار سے ہماری ہتک واضح ہے۔ اس نے خیال کیا کہ اگر ایک ہندو کی راکھ دریائے سندھ میں بہا دی گئی تو وہ دریا ناپاک ہو جائے گا۔ ہندو گھرانے میں جنم لینا کوئی جرم نہیں۔ ہندو کی حیثیت سے زندگی بسر کرنا کوئی جرم نہیں۔ جو لوگ ہندوؤں سے نفرت کرتے ہیں وہ درحقیقت نوع انسان کے دشمن ہیں۔
>
> میں دریائے سندھ کو مقدس دریا سمجھتا ہوں۔ لفظ ہندو خود لفظ سندھو سے مشتق ہے۔ ہمارے ویدوں نے دریائے سندھ کی وادی میں جنم لیا تھا۔ تم ہندوؤں کا فریضہ ہے کہ پاکستان نے جو تمہاری ہتک کی ہے اسے یاد رکھو اور مناسب موقع پر اس علاقہ کو پھر سے فتح کرو۔ میری یہ خواہش شاید آنے والی ہندو نسلوں کے دل میں، ملک کے ان دو حصوں کو پھر سے ایک کر دینے کے جذبہ کو بیدار رکھے۔

مضمون کے آخر میں، گوپال گوڈسے نے لکھا ہے:

> نتھورام کی وصیت ایک خط کی شکل میں ہے۔ اس نے، اس میں اپنی اس خواہش کا اظہار کیا ہے کہ جب دریائے سندھ دوبارہ ہندوستان کے علاقہ میں بہنے لگے تو اس کی راکھ کو اس میں بہا دیا جائے۔ نتھورام اور اس کے ساتھی نارائن آپٹے کی راکھ پونہ میں، ہمارے گھر میں چاندی کے ایک برتن میں محفوظ رکھی ہے۔ ہر سال ۱۵ نومبر کو، ہزاروں افراد اس کے درشن کے لئے آتے ہیں۔ اور اس عہد کی تجدید کرتے ہیں کہ وہ مقدس دریائے سندھ کو پھر سے ہندوستان کا دریا بنانے کے لئے پوری پوری کوشش کریں گے۔

اس اقتباس کا آخری حصہ خصوصیت سے غور طلب ہے۔ نتھورام گوڈسے کی خواہش کو ایک فرد کی جذباتی خواہش قرار

طلوع اسلام: یہ بات آج ہی سنی ہے۔ معلوم نہیں اس میں کہاں تک صداقت ہے۔

دیا جا سکتا ہے۔ لیکن ہر سال، ہندو قوم کے سینکڑوں افراد کا اس ڈاکہ کے درشنوں کے لئے جانا اور گوڑتے کی خواہش کو عملی جامہ پہنانے کے عہد کی تجدید کرنا، اس قوم کی نفسیات کی غمازی کرتا ہے۔ قوموں میں اس قسم کے شعار بڑی اہمیت رکھتے ہیں۔ یہودیوں سے ملک فلسطین چھن گیا۔ ان کی مملکت گئی، حکومت گئی۔ ان کا مقدس شہر یروشلم ان کے ہاتھوں سے نکل گیا۔ وہ بے گھر، بے در، صحرا نورد قوم بن گئی۔ لیکن اس تمام عرصہ میں اس نے اپنے ایک شعار کو قومی یادگار کے طور پر قائم رکھا۔ وہ یروشلم جاتے اور سابقہ ہیکل کی ایک دیوار کے سامنے جا کر گریہ وزاری کرتے اور پکار پکار کر فریاد کرتے کہ ہمیں ہمارا کھویا ہوا وطن کب واپس ملے گا۔ (اس دیوار کا نام ہی "دیوارِ گریہ" پڑ گیا تھا)۔ وہ صدیوں تک ایسا کرتے رہے اور کسی نے ان کی اس "مذہبی رسم" کو چنداں اہمیت نہ دی۔ لیکن انہوں نے اس رسم کے ذریعے اپنی ہر نسل کے دل میں اپنے گم گشتہ وطن کی بازیابی کی خواہش کو زندہ اور بیدار رکھا۔ یہ اسی جذبہ کا اثر تھا کہ وہ اس خطۂ زمین پر دوبارہ قابض ہو گئے۔

مسٹر سبرامنیم نے کہا تھا کہ ہم بھارتیوں کو، پاکستان کو فتح کرنے کے لئے، نفسیاتی طور پر تیار رہنا چاہیئے۔ گوڑتے کی "راکھ درشن" کا شعار اسی نفسیاتی تیاری کی ایک مثال ہے۔ یہ واقعہ تو اخبار میں چھپ کر ہمارے سامنے آ گیا ہے۔ کیا معلوم وہاں اس قسم کی کتنی نفسیاتی تیاریاں ہو رہی ہیں۔ مسٹر سبرامنیم نے اس حقیقت پر سے پردہ اٹھا دیا تھا جب کہا تھا کہ:۔

کسی بھارتی نے تقسیمِ ہند کو کبھی بھی تسلیم نہیں کیا۔ اور نہ کبھی کرے گا۔

اسی بنا پر قرآنِ مجید نے چودہ سو سال پہلے تاکید کر دی تھی کہ: یَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَتَّخِذُوا بِطَانَةً مِّن دُونِكُمْ لَا يَأْلُونَكُمْ خَبَالًا۔ اے جماعتِ مومنین! دیکھنا، اپنوں کے سوا کسی کو اپنا ہمراز و دمساز نہ بنانا۔ وہ تمہاری تخریب اور تباہی میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھیں گے۔ وَدُّوا مَا عَنِتُّمْ۔ جس بات سے تمہیں نقصان پہنچے وہ اس سے بہت خوش ہوتے ہیں۔ قَدْ بَدَتِ الْبَغْضَاءُ مِنْ أَفْوَاهِهِمْ وَمَا تُخْفِي صُدُورُهُمْ أَكْبَرُ۔ تمہارے خلاف جو کچھ وہ سوچتے رہتے ہیں اس میں سے یونہی کوئی بات ان کے منہ سے نکل جاتی ہے تو تمہیں کچھ اندازہ ہو جاتا ہے کہ ان کے عزائم کیا ہیں۔ لیکن جو کچھ ان کے سینے میں مخفی ہوتا ہے، وہ اس سے کہیں زیادہ خطرناک ہوتا ہے۔ (۳/۱۱۸)

اب سوال یہ ہے کہ اس قسم کے دشمن سے محفوظ رہنے کے لئے کیا کیا جائے۔ اس کے لئے قرآنِ کریم نے کہا ہے کہ: وَأَعِدُّوا لَهُم مَّا اسْتَطَعْتُم مِّن قُوَّةٍ وَمِن رِّبَاطِ الْخَيْلِ۔ (۸/۶۰) "اپنی سرحدوں کو فوجی چھاؤنیوں کے ذریعے مستحکم رکھو"۔ لیکن یہ اس تدبیر کا صرف خارجی پہلو ہے۔ اس کا داخلی پہلو یہ ہے کہ:۔

وَإِن تَصْبِرُوا وَتَتَّقُوا لَا يَضُرُّكُمْ كَيْدُهُمْ شَيْئًا۔ (۳/۱۲۰)

اگر تم ثابت قدم رہے اور قوانینِ خداوندی کی نگہداشت کرتے رہے تو ان کی خفیہ تدبیریں اور سازشیں تمہارا کچھ بھی نہیں بگاڑ سکیں گی۔

پاکستان، ان دشمنوں کے ہاتھوں سے صرف اسی صورت میں محفوظ رہ سکتا ہے۔ اپنی سرحدوں کی حفاظت اور قوانینِ خداوندی کی اطاعت۔